مولانا مودودیؒ کے

خطوط

سید امین الحسن رضویؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس دور کے نامور مفکر اور صاحبِ قلم تھے۔ان کی تحریر میں بڑی تازگی اور قوت وتوانائی پائی جاتی تھی۔دورِ جدید کے ذہن کو سمجھنے،اور اس کی علمی سطح سے بات کرنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی۔اللہ تعالیٰ کا ان پر بڑا فضل وکرم رہا کہ ان کی یہ صلاحیت شروع ہی سے دین کی خدمت اور اس کی سربلندی کے لیے وقف رہی۔آغازِ شباب سے لے کر آخری لمحات حیات تک کوئی اور ہدف ان کے سامنے نہیں رہا۔دین پر ہونے والے علمی اور فکری حملوں کے مقابلے میں وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے،ان کے جاندار قلم نے بہت سی گتھیوں کو سلجھایا، نت نئے اعتراضات کو رفع کیا اور شکوک وشبہات کے گرد وغبار کو صاف کر کے دین کے صحیح تصور کو نکھارا۔انھوں نے اسلام کو دنیا کا برتر نظامِ فکر وعمل اور آخرت کی نجات کا واحد ذریعہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی،جو مدعیانِ علم آج کے دور میں اسلام کو ناقابلِ عمل اور ایک فرسودہ نظام قرار دے رہے تھے۔ان کے دلائل کے بخیے ادھیڑ دیے اور جو دانشور اسے تضحیک کا نشانہ بنائے ہوئے تھے ان کی دانشوری کا بھرم کھول دیا۔وہ اس دور میں اسلام کے انتہائی ذہین وکیل اور قابل ترجمان تھے اور اپنے زورِ بیان اور قوتِ استدلال سے اسلام کی بہت ہی عمدہ وکالت اور ترجمانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی زندگی کا ایک تابناک اور درخشاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ محض مفکر اور مصنف نہ تھے بلکہ انھوں نے اسلام کو معاشرے میں قائم اور نافذ کرنے کی منظم جدوجہد شروع کی اور بے شمار بندگانِ خدا کے دلوں کو اس یقین سے بھر دیا کہ اسلام غالب اور سربلند ہونے کے لیے آیا ہے۔اگر صحیح نہج سے کوشش ہو اور اس کے تقاضے پورے کیے جائیں تو آج بھی وہ دنیا پر ابرِ رحمت بن کر چھا سکتا ہے۔اس کی کامیابی وکامرانی کی راہ میں کوئی نظریہ اور

کوئی فلسفہ رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ انھوں نے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کا جو جوش اور جذبہ پیدا کیا اس نے کتنی ہی زندگیوں کا رخ بدل دیا اور آج بھی وہ کتنے ہی سینوں کو گرمائے ہوئے ہے۔ دین کی دعوت اور اس کے قیام کی جدوجہد مولانا مودودیؒ کی شخصیت پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ دنیا انھیں اسلامی نظام کے علم برداری کی حیثیت سے جانتی اور یاد کرتی ہے۔ ان کے ذکر کے ساتھ اس جدوجہد کا تصور ذہنوں میں خود بہ خود اُبھر آتا ہے۔

اس دنیا میں پیغمبروں کے علاوہ کوئی شخص معصوم نہیں ہوتا۔ ہر ایک سے کمزوریوں اور خامیوں کا صدور ہوا ہے اور ہوتا رہے گا، اس سے بڑی سے بڑی شخصیت مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن یہ بڑی ناانصافی بلکہ کم ظرفی ہوگی کہ کسی خادمِ دین کی دو ایک یا چند فروگزاشتوں کی وجہ سے اس کے تمام مفید کارناموں پر پانی پھیر دیا جائے۔ مولانا مودودیؒ بھی انسان تھے۔ دینی مسائل کی جو تفہیم و تشریح انھوں نے کی ہے اور جو وسیع علمی ذخیرہ چھوڑا ہے اس کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر خامی سے پاک ہے۔ اس میں لغزش اور فروگزاشت کا امکان ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کے قیام کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں اور جو اقدامات کیے ان میں سے بھی بعض سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی دینی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی نظام کے قیام کی جب بھی اور جہاں بھی کوشش ہوگی ان کے علم و فکر سے فائدہ اُٹھایا جائے گا۔

مولانا مودودیؒ کی گوناگوں اور متنوع دینی خدمات کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ قبول عطا فرمایا اور بے شمار بندوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دی۔ وہ ان سے قرب و تعلق ہی نہیں محسوس کرتے بلکہ ان کے شیفتہ اور گرویدہ ہیں۔ یہ تعلق اور محبت توقع ہے کہ مولانا مودودیؒ کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ اس سے کوئی مادی غرض یا دنیوی منفعت وابستہ نہیں ہے۔ یہ محض اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے ہے۔

مولانا مودودیؒ سے محبت کرنے والوں بلکہ ان کے عقیدت مندوں میں ہمارے محترم جناب سید امین الحسن رضوی (سابق ایڈیٹر ریڈینس، دہلی) بھی ہیں۔ وہ کبھی کبھی مولانا کو خط لکھتے رہے ہیں اور مولانا نے ان کے زیادہ تر خطوط کا جواب اپنے قلم سے دیا ہے اور کبھی اپنے کسی معاون سے لکھوایا ہے۔ محترم رضوی صاحب نے ان تمام خطوط کو محفوظ رکھا اور اب انھیں مرتب

اور شائع کر کے اپنی عقیدت اور محبت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کے خطوط میں بھی ان کے قلم کی انفرادیت نمایاں ہے۔ وہ ہر طرح کے تکلف اور تصنع سے پاک اور بے ساختگی اور برجستگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ بے تکلف تحریر، لکھنے والے کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مولانا کے خطوط بھی ان کی سیرت کے ترجمان ہیں۔ ان سے مولانا کا اخلاق، ان کا انکسار اور خاکساری، سیاسی بصیرت، جرأت و ہمت اور پامردی اور استقامت غرض ان کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ دو ایک مقامات پر مزاح اور بے تکلفی کا انداز بھی ہے لیکن اس سے مولانا کی سنجیدگی اور عظمت مجروح نہیں ہوتی بلکہ ان کی زندہ دلی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ فکری بلندی کے ساتھ خوش طبع اور خوش مزاج نظر آتے ہیں۔

ان مکاتیب میں سے بیشتر کا تعلق کسی نہ کسی دینی اور علمی مسئلے سے ہے۔ مولانا مرحوم دو ٹوک الفاظ میں بات کہنے کے عادی ہیں۔ ان کی یہ خوبی اِن مکاتیب میں بھی موجود ہے۔ بعض نازک اور پیچیدہ مسائل میں بھی انھوں نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اس سے ان ہی کے الفاظ میں ان کا موقف واضح ہوتا ہے اور غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی۔

جناب سید امین الحسن رضوی صاحب نے مولانا مودودیؒ سے اپنے تعلقات اور ہر خط کا پس منظر بڑے ذوق وشوق اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کن حالات میں مولانا کی طرف رجوع کیا اور مسئلہ کیا تھا جس کا انھوں نے جواب دیا۔ رضوی صاحب جہانیان جہاں گشت ہیں۔ انھوں نے دنیا جہان کے سفر کیے ہیں۔ ان خطوط کے پس منظر میں اپنے اسفار کا حال انھوں نے اس سلیقے اور عمدگی سے بیان کیا ہے کہ اس میں ایک سفر نامہ کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

اتنے اچھے اور خوبصورت مجموعۂ مکاتیب پر کسی مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، لیکن رضوی صاحب کی خواہش ہے کہ میں بھی اس بزم میں شریک ہو جاؤں۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ اس بہانے سے مجھے اپنے جذبات و تاثرات کے اظہار کا موقع مل گیا، جس کے لیے میں رضوی صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

جلال الدین عمری

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۱۸/اکتوبر۱۹۹۲ء

عرضِ حال

تاریخ ۲۲؍ستمبر ۱۹۷۹۔ وقت گیارہ بجے شب۔ میں اپنے گھر کے صحن میں پلنگ پر لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں ان دنوں انگریزی ہفت روزہ ریڈینس ویوز ویکلی، دہلی (Radiance Views Weekly) کا ایڈیٹر تھا اور میری رہائش بھی ریڈینس کے دفتر ہی کی بالائی منزل کے ایک حصہ میں تھی۔ میں پلنگ سے اُٹھ کر کمرے میں گیا، اور رسیور اٹھایا۔ امریکہ سے کوئی صاحب (جن کا نام مجھے یاد نہیں) بول رہے تھے۔ انھوں نے معلوم کیا میں کون بول رہا ہوں۔ میں نے اپنا نام بتایا تو ان صاحب نے بعد سلام یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا انتقال ہوگیا اور کہا کہ انھوں نے مرکز جماعت اسلامی میں ٹیلی فون کیا تھا لیکن وہاں کی لائن خراب ہے اس لیے وہاں کسی سے گفتگو نہیں ہو سکی۔

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ مولانا بیمار تھے اور بہ غرض علاج امریکہ گئے ہوئے تھے، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ مولانا کی صحت اتنی گر چکی ہے۔ بہر حال موت تو اپنے مقررہ وقت پر آنی ہی تھی، سو آ گئی تاہم یہ خبر سن کر دماغ پر ایک سناٹا سا چھا گیا اور میں ٹیلی فون کا رسیور رکھ کر چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیے ساکت کھڑا رہا اور میری چشم تصور میں مولانا کا پر نور چہرا گھومتا رہا۔

پھر میں نے آنکھیں کھولیں، ڈائریکٹری میں پریس ٹرسٹ آف انڈیا (P.T.I.) کا نمبر تلاش کیا، نمبر ملایا اور کہا کہ میں نیوز ایڈیٹر صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ چند سکینڈ بعد نیوز ایڈیٹر صاحب سے لائن ملا دی گئی۔ اس طرف سے جو صاحب بول رہے تھے وہ لہجے سے جنوبی ہند (مدراس یا کیرلا) کے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو انھوں نے کہا وہ نام سے مجھے جانتے ہیں۔ میں نے انھیں مولانا کے انتقال کی خبر سنائی اور خواہش کی کہ وہ صاحب جن

کے انتقال کی خبر میں سنا رہا ہوں کون تھے؟ میں نے انہیں بتایا کہ وہ پاکستان کی جماعت اسلامی کے امیر تھے۔[۱] اتنا سن کر ہی انھوں نے قطع کلام کی معذرت کرتے ہوئے بڑی شائستگی سے مجھے جواب دیا کہ ایجنسی کا اصول یہ ہے کہ کسی اہم شخصیت کے بارے میں ایسی خبر وہ اسی صورت میں قبول کرتے ہیں جب کہ وہ ان کے اپنے ذرائع سے ملی ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ٹیلی فون رکھتا ہوں وہ ڈائریکٹری میں خود ریڈینس کا فون نمبر دیکھ کر نمبر ملائیں تو اس صورت میں اطمینان ہو جائے گا کہ میں ریڈینس کے دفتر سے ہی بول رہا ہوں۔ انھوں نے پھر ملائمت سے مجھ سے کہا کہ انھیں اس بات کا تو شبہ نہیں ہے کہ میں ریڈینس سے بول رہا ہوں اور نہ وہ میری دی ہوئی اطلاع کی صداقت پر شبہ کر رہے ہیں بلکہ وہ ایجنسی کے مقررہ طریقہ کار سے مجبور ہیں۔ میں ان کی مجبوری سمجھ گیا اور چند رسمی الفاظ کے تبادلے کے ساتھ ہماری گفتگو ختم ہوگئی۔

میں نے صحن میں آکر اہلیہ کو جگایا اور انھیں یہ خبر سنائی۔ وہ بھی بہت ملول ہوئیں۔ ہم دونوں جولائی ۷۸ء میں مولانا مرحوم کے گھر گئے تھے، اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے اندر جا کر ٹیلی فون اٹھایا تو پی ٹی آئی سے وہی صاحب بول رہے تھے، جن سے کچھ دیر قبل میری گفتگو ہوئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں امریکہ سے ان کے ذریعہ سے اسی وقت مولانا کے انتقال کی خبر وصول ہوئی ہے اور مکرر معذرت کرتے ہوئے مولانا کی شخصیت کے بارے میں مزید تفصیل بتانے کی مجھ سے خواہش کی۔ میں نے ان کے ادارے کی ضرورت کے مطابق مختصراً انھیں بتایا وہ نوٹ کرتے رہے اور میرا شکریہ ادا کر کے گفتگو منقطع کر دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوگئی۔

مولانا مودودیؒ سے واقفیت کی ابتدا

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ میں مولانا مودودیؒ کے نام سے پہلے پہل کب واقف ہوا اور ان کی کونسی کتاب یا مضمون سب سے پہلے پڑھا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ ۴۷، ۴۸ء میں جب میں عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) میں ایل ایل بی کا طالب علم تھا اور یونیورسٹی کے 'بی' ہاسٹل میں رہتا تھا، ان

---

(۱) مولانا کے انتقال کے وقت جماعت اسلامی پاکستان کے امیر مولانا مودودیؒ نہیں بلکہ جناب میاں طفیل محمد صاحب تھے۔ (ت۔م)

دنوں میں مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی دونوں سے نام کی حد تک واقف ہو چکا تھا اور کم از کم ایک کتاب ''بناؤ اور بگاڑ'' کی حد تک اچھی طرح یاد ہے کہ میں اسے پڑھ چکا تھا۔ یہ بھی مجھے یاد نہیں کہ میں مولانا مرحوم اور جماعت اسلامی کے نام سے کس کے وسیلے سے واقف ہوا تھا اور نہ یہ یاد ہے کہ 'بناؤ اور بگاڑ' مجھے پڑھنے کے لیے کہاں سے ملی تھی۔ بہت سوچتا ہوں تو خیال پڑتا ہے کہ میری واقفیت کا ذریعہ حامد احمد خاں صاحب تھے جو اس وقت ایم۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے اور میرے ہاسٹل کے ساتھی تھے (بعد میں یہ رکن جماعت ہوئے اور کوئی ربع صدی بعد جب میں اپنے وطن رائچور سے دہلی منتقل ہوا تو یہاں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی یہ ان دنوں ہمدرد دواخانہ سے منسلک تھے اور دہلی کی مقامی جماعت کے امیر بھی)، بناؤ اور بگاڑ، کو پڑھ کر میں نے کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا اور نہ مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی ہی کے بارے میں کچھ اور جاننے کی تحریک میرے اندر پیدا ہوئی۔

میں ایل ایل بی کے آخری سال کا امتحان دے کر ۱۹۴۸ میں اپنے وطن رائچور (جو اس وقت تک ریاست حیدر آباد کا ایک ضلع تھا) واپس چلا گیا لیکن وکالت کرنے پر میری طبیعت مائل نہیں تھی اس لیے وکالت شروع نہیں کی حالاں کہ میرے حقیقی چچا مرحوم سید نظیر حسن رضوی صاحب اور میرے حقیقی بڑے بھائی سید منظور الحسن رضوی رائچور میں ہی مشترکہ طور پر وکالت کرتے تھے اور اس میدان میں بڑی اچھی شہرت کے حامل تھے۔ مجھ پر گھر والوں کا ہلکا ہلکا دباؤ بھی تھا کہ میں وکالت شروع کردوں، لیکن میری طبیعت آمادہ نہ ہوتی تھی، ان ہی دنوں رائچور میں میرا ربط محمد جعفر منیار صاحب سے ہوا جو اس وقت جماعت کے ایک ڈویژن کے ناظم ہیں۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ اس وقت وہ جماعت کے رکن تھے یا ہمدرد یا متفق[1] لیکن تھے جماعت کے نہایت پرجوش حامی و مبلغ۔ انھوں نے مجھے مولانا مرحوم کی کئی کتابیں پڑھنے کو دیں جنھیں میں بڑے شوق سے پڑھتا رہا۔ پھر میں نے ایک نیم سرکاری کارپوریشن میں ملازمت کرلی اور تعلقہ آفیسر ہوکر رائچور سے بہت دور ملازمت پر چلا گیا۔ میری ملازمت کا عرصہ ایک سال سے کچھ زیادہ رہا اور اس عرصے میں مولانا کی کوئی تحریر میں نے نہیں پڑھی۔ ایک سال اور کچھ دن ملازمت کے بعد میں استعفیٰ دے کر پھر اپنے وطن رائچور واپس آ گیا تو محمد جعفر صاحب سے روابط و مراسم

---

(۱) اس وقت وہ جماعت اسلامی حلقہ کرناٹک کے معاون امیر حلقہ ہیں۔ (ت۔م)

کی تجدید ہوئی، مولانا مودودیؒ کی کتابیں پھر مطالعے میں آنی شروع ہوئیں اور میرے ذہن پر رفتہ رفتہ مولانا مودودیؒ کی فکر اور ان کی عظمت کے نقوش مرتسم ہونے لگے اور وکالت کا پیشہ اختیار نہ کرنے کا میرا ارادہ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔(۱)

ستمبر ۵۱ء میں میری شادی ہوگئی۔ چوں کہ میں وکالت کرنا نہیں چاہتا تھا اور ملازمت سے استعفیٰ دے کر بالکل بیکار تھا اس لیے طبیعت پر بڑا بوجھ تھا۔ ادھر مجھ پر گھر والوں کا بن کہا دباؤ اور احباب کا اصرار بھی تھا کہ میں کسی دوسرے مشغلے کے ہاتھ آنے تک کے عرصے کے لیے ہی سہی وکالت شروع کردوں۔

اس زمانے میں میری ایک بہن اپنے شوہر کے ساتھ ڈھاکہ میں رہتی تھی جو اس وقت کے مشرقی پاکستان کی حکومت کا مستقر تھا۔ ان کا خط آیا کہ وہ ہندوستان آنا چاہتی ہیں، یہاں سے کوئی جائے تو وہ اس کے ساتھ آجائیں۔ اس زمانے میں ہندوستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان سفر کے لیے کسی پاسپورٹ یا پرمٹ کی ضرورت نہ تھی، آزادی سے سفر کیا جا سکتا تھا۔ چناں چہ اپنی بہن کو لانے لیے ڈھاکہ چلا گیا، اتفاق سے کچھ اسباب ایسے ہوئے کہ میری بہن کی روانگی میں تاخیر ہوگئی اور مجھے ڈھاکہ میں تقریباً تین ماہ رکنا پڑ گیا۔ اس عرصے میں میرے بہنوئی (ظہیر الدین انصاری صاحب) کے حلقۂ احباب میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، جن کا نام غالباً عبدالخالق تھا یہ میرے بہنوئی صاحب کے ایک دوست کے چھوٹے بھائی تھے اور کسی کالج میں پڑھتے تھے۔ یہ جماعت اسلامی کے متاثرین میں سے تھے اور ڈھاکہ کی مقامی جماعت کے فعال کارکنوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھیں جب جماعت کے لٹریچر سے میری دلچسپی کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے کتابیں دینی شروع کیں اور ایک دفعہ وہ مجھے مقامی جماعت کے ہفتہ وار اجتماع میں بھی لے گئے۔ جماعت کے کسی باضابطہ اجتماع میں شریک ہونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ وہاں چوں کہ کارروائی زیادہ تر بنگالی زبان میں ہو رہی تھی اس لیے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہو سکی۔ اس عرصے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہوئی کہ ایک دفعہ میرے بہنوئی صاحب کے گھر پر چند احباب جمع تھے۔ اس وقت پاکستان کی مجلس دستور ساز نے علماء کی زوردار کوششوں کے نتیجے میں جس کے سرخیل مولانا مودودیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے قرارداد مقاصد منظور کرلی تھی اور اسے دستور کا

---

(۱) لیکن جون ۱۹۵۴ء میں ایک سانحہ کے سبب میں نے وکالت شروع کردی۔

ابتدائیہ (Premele) بنا دیا گیا تھا۔[۱] دوران گفتگو قرارداد مقاصد کے حوالہ سے بینکوں کی ملازمت کے جواز پر بات چل پڑی۔ پاکستانی احباب کا خیال تھا کہ قرارداد مقاصد کے منظور ہو جانے کے بعد پاکستانی بینکوں میں ملازمت جائز ہونی چاہیے۔ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں تھا۔ محفل کے برخاست ہونے کے بعد میں نے مولانا مودودیؒ کو اس بارے میں خط لکھ کر ان سے استفسار کیا۔ مولانا کے نام یہ میرا پہلا خط تھا اور چوں کہ مجھے وثوق نہیں تھا کہ مولانا مودودیؒ جیسی عظیم اور معروف شخصیت میرے خط کو درخور اعتنا سمجھے گی (یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ مولانا خطوط کے جواب دینے کا حد درجہ التزام فرماتے تھے) اس لیے میں نے اپنی اس جرأتِ رندانہ کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا، لیکن چند ہی دنوں بعد مولانا کی طرف سے ملک غلام علی صاحب کا دستخطی خط میرے خط کے جواب میں وصول ہو گیا۔

اس کے کچھ دنوں بعد میں اپنی بہن کو لے کر رائچور آ گیا۔ رائچور پہنچنے پر پھر اسی صورتِ حال سے دوچار تھا کہ کیا کروں۔ ان دنوں رائچور میں غازی الدین نامی ایک صاحب سشن جج تھے جو نہایت خوش شکل، قابل اور باوقار جج ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دین دار بھی تھے۔ میری ان سے واقفیت تھی۔ میرے والد اور چچا کی خواہش پر جس میں ان کی اپنی خواہش کو بھی دخل تھا انھوں نے ایک روز مجھے شام کی چائے پر اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ چائے پیتے ہوئے انھوں نے مجھ سے وکالت شروع کرنے کو کہا۔ گفتگو لمبی ہوتی گئی۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا اور میں نے ان کے پیچھے وہیں مغرب کی نماز پڑھی۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ جب ہم دونوں مصلّے پر کھڑے ہوئے اور میں اقامت کہہ رہا تھا تو میری نگاہ آسمان پر پڑی اور مہینہ کا پہلا چاند نظر آیا یہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۲ کا چاند تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد بھی کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی اور میں انھیں کوئی قطعی جواب دیے بغیر چلا آیا۔

طبیعت میں اضطراب تھا اور میں کوئی فیصلہ کر نہیں پا رہا تھا۔ بالآخر عشاء کی نماز کے بعد میں مولانا مودودیؒ کو خط لکھنے بیٹھ گیا اور قلم برداشتہ چھ ورق کا طویل خط لکھ دیا۔ اس کے بعد طبیعت کچھ ہلکی ہوئی اور میں سو گیا۔ صبح کو خط ڈاک خانے بھیج دیا۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور اس کے علاوہ اسی

---

(۱) جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے اسے ابتدائیہ کے مقام سے ہٹا کر دستور کی دفعات میں جگہ دے دی۔

دن میں نے اپنا دوسرا خط مولانا کو روانہ کیا اس لیے بھی وہ دن یادرہ گیا کہ اسی دن صبح تقریباً گیارہ بجے میرے بڑے لڑکے انور حسنین کی ولادت ہوئی۔

چند دنوں بعد مولانا مودودیؒ کا جواب آ گیا۔ افسوس ہے کہ وہ خط میرے پاس محفوظ نہیں رہا، لیکن اتنا یاد ہے کہ اس خط میں مولانا نے بہ حیثیت مجموعی موجودہ عدالتی نظام کے تحت وکالت کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اگر وکالت کو اپیل کے مقامات تک محدود رکھا جائے جس میں نہ مقدمہ بنایا جاتا ہے اور نہ شہادت پیش کی جاتی ہے بلکہ صرف تصفیہ شدہ مقدمہ کے فیصلے کو قانونی اور توازن شہادت کی بنیادوں پر منسوخ کرنے یا بہ حال رکھنے کے لیے بحث کی جاتی ہے تو وہ روا ہے۔

جب مولانا نے قرآن کی تفسیر تفہیم القرآن کے لیے ان مقامات کا سفر شروع کیا، جن کا ذکر قرآن شریف کی مختلف سورتوں میں آیا ہے تو اس سفر کی روداد قسط وار ماہنامہ 'ترجمان القرآن' میں شائع ہوئی جو مولانا کے ایک رفیقِ سفر مولانا عاصم الحداد صاحب 'ارض القرآن کا سفر' کے عنوان سے لکھتے تھے۔ اس کی ایک قسط میں یہ تذکرہ آیا کہ سعودی عرب کے فرماں روا نے مولانا اور ان کے رفقائے سفر کے وہاں پہنچ جانے کے بعد کچھ رقم مولانا کے مصارفِ سفر کے لیے بھجوائی۔ جوشِ عقیدت میں مجھے مولانا کا اس رقم کو قبول کر لینا ان کے مرتبے سے فروتر محسوس ہوا اور غایت سفر کے احترام کے منافی بھی۔ چناں چہ میں نے مولانا کو خط لکھا جس کا ایک جملہ مجھے یاد رہ گیا ہے جو کچھ یوں تھا کہ یہ تو شاہانہ داد و دہش والا انداز ہوا جسے قبول کرنا آپ کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس کا جواب بھی مولانا نے دیا۔ افسوس ہے کہ مولانا کا وہ خط بھی میرے پاس محفوظ نہیں رہا۔ لیکن یہ مجھے بہ خوبی یاد ہے مولانا کا جواب بہت پُر متانت تھا اور یہ بھی مجھے یاد ہے کہ مولانا کے اس جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس بات کا میری طبیعت پر بڑا اثر ہوا کہ مولانا جیسی عظیم المرتبت ہستی کو ایک بالکل غیر معروف اجنبی کو اور وہ بھی ایسے بے ہنگم خط کا جواب دینے میں تکلف نہیں ہوا اور میں نے سوچا کہ داعی کے منصب کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کتنی عمدہ مثال مولانا پیش کرتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ سے پہلی ملاقات

مولانا مودودیؒ سے اپنی پہلی ملاقات میں قطع نظر ملاقات کی تین باتیں خصوصیت سے یاد ہیں۔ ۱۹۶۳ کے ماہ اکتوبر میں میرا اس وقت کے مغربی پاکستان کا پہلا سفر ہوا میں نے یہ سفر ریل سے براہ امرتسر کیا اور ۱۳؍اکتوبر کو لاہور پہنچا۔ لاہور اسٹیشن سے ٹیکسی میں اپنے رشتے داروں کے گھر (۱-ایف ماڈل ٹاؤن) جاتے ہوئے فطری طور پر دونوں طرف نگاہیں ڈال رہا تھا کہ بائیں طرف ایک بورڈ پر نظر پڑی، جس پر بڑے حروف میں 'اچھرہ' لکھا ہوا تھا اسے پڑھ کر طبیعت میں ہلکا سا ہیجان پیدا ہوا، اس لیے کہ ترجمان القرآن پر دفتر کا پتا ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور، میں کئی دفعہ پڑھ چکا تھا اور یہ بھی پتا تھا کہ مولانا مرحوم کی رہائش گاہ بھی وہیں ہے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے مولانا مودودیؒ کے بارے میں تو نہیں البتہ یہ پوچھا کہ کیا ذیلدار پارک بھی یہیں کہیں ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں دوپہر میں ایک بجے کے قریب گھر پہنچا تھا اور شام کو عصر کی نماز سے اول وقت فارغ ہو کر 'اچھرہ' کے لیے روانہ ہو گیا، اچھرہ پہنچ کر تلاش کرتا ہوا ۵-اے ذیلدار پارک میں داخل ہوا تو اس وقت مولانا کی عصری مجلس آراستہ تھی۔ بعد نماز عصر مولانا کے مکان کے باہر کمپاؤنڈ میں لان پر کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں[۱] مولانا کی کرسی درمیان میں ہوتی اور دورویہ دوسری کرسیاں ہوتی تھیں۔ عصر کی نماز کے بعد مولانا اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے اور ملاقاتیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں جب پہنچا ہوں تو مولانا کے دونوں طرف کی کرسیوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے، بائیں سمت والی کرسیوں میں کوئی پانچویں یا چھٹی کرسی خالی تھی میں محفل کو سلام کر کے اس کرسی پر بیٹھ گیا اور باتیں سننے لگا۔ مجھے یاد ہے اس وقت کوئی صاحب یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ ملک شام میں مولانا کی بعض کتابوں پر جن کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا پابندی عائد کر دی گئی تو وہاں کے نوجوان کتاب کا سرورق پھاڑ کر وہ کتابیں اپنے پاس چھپا کر رکھتے تھے اور پھر چھپ کر ان کا اجتماعی مطالعہ کیا کرتے تھے...میں نے دیکھا کہ مولانا کی اس مجلس میں ایسے لوگ بھی تھے جو نہ تو خود کچھ بولتے تھے اور نہ گفتگو میں کوئی حصہ لیتے تھے، بس کچھ

---

(۱) جماعت اسلامی پاکستان اور ''ترجمان القرآن'' کے دفاتر یہیں تھے۔ اسی کے ایک حصے میں مولانا کی رہائش گاہ بھی تھی۔

دیر بیٹھنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ مولانا کے قریب کی کرسی خالی ہوئی، تو برابر کی کرسی والے صاحب اس پر چلے گئے اور اسی طرح ان کے بعد والے لوگ تو میں بھی مولانا سے بہ قدر ایک کرسی کے قریب تر ہوتا گیا۔ اس طرح ہوتے ہوتے میں دوسرے نمبر کی کرسی تک پہنچ گیا۔ اسی لان میں ایک طرف سے کسی صاحب نے مغرب کی اذان دی اور ہم لوگ مغرب کی نماز کے لیے اٹھ گئے۔ 'ترجمان القرآن' کے دفتر میں اسٹاف کے جو لوگ کام کر رہے تھے وہ بھی آگئے اور صف بندی ہوگئی۔ مولانا امامت کے لیے مصلے پر کھڑے ہوئے اور میں پہلی ہی صف میں مولانا کے عین پیچھے کھڑا ہوا۔ نماز شروع ہوئی تو مولانا نے سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ لہب کی تلاوت شروع کی۔ یہاں ایک بات خاص طور سے قابل ذکر ہے جسے جب بھی یاد کرتا ہوں اپنے اوپر ہنسی آتی ہے۔ بات یہ تھی کہ اس وقت تک میں نے جن اماموں کے بھی پیچھے جہری نماز پڑھی تھی اور ان میں سے جس کسی نے بھی سورۂ لہب کی تلاوت کی تو کسی نے بھی وَامْرَأَتُهٗ کا تلفظ ٹھیک سے ادا نہیں کیا تھا کچھ اس طرح سے اس لفظ کو ادا کرتے تھے کہ وَامْرَأَتُهٗ سمجھ میں آتا تھا اور اس سے مجھے الجھن ہوتی تھی۔ اب جو مولانا نے اس سورہ کی تلاوت شروع کی تو معاً مجھے یہ بات یاد آگئی اور میں نے بہت غور سے سننا شروع کیا۔ مولانا مرحوم نے انتہائی صاف تلفظ میں یہ لفظ ادا کیا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ میں مولانا مرحوم کا امتحان لے رہا تھا یا یہ کہ اس لفظ کو صحیح تلفظ سے ادا کرنا کچھ مشکل ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ میں نے پہلی دفعہ کسی کو اتنے واضح انداز میں اس لفظ کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ یوں بھی مولانا کی قرأت سادہ لیکن اتنی پیاری تھی کہ مجھے نماز ہی میں بے ساختہ مسعود عالم ندوی مرحوم کی (بہت پہلے اپنی کتاب 'دیار عرب میں چند ماہ') لکھی ہوئی بات یاد آ گئی کہ انہیں مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران مولانا کے پیچھے پڑھی ہوئی نمازیں یاد آتی تھیں۔

سنتوں سے فارغ ہو کر میں کرسیوں کی طرف آیا تو مولانا کی کرسی کے بائیں جانب کی کرسیوں کی قطار میں پہلی کرسی خالی تھی اور میں اسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مولانا بھی تشریف لائے اور کچھ دوسرے حضرات بھی آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ غالباً اس وجہ سے کہ میں حیدر آباد کی سلی ہوئی شیروانی پہنے ہوئے تھا اور یوں بھی غیر پاکستانی لگ رہا تھا مولانا اپنی کرسی پر بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا۔ ''معاف کیجیے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' میں نے

جواب دیا۔ ''مولانا میری آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ میرا نام امین الحسن رضوی ہے اور سابق ریاست حیدرآباد دکن کے ضلع رائچور سے آیا ہوں۔'' اس وقت ۱۹۵۶ء میں ہندوستان میں ریاستوں کی تنظیم جدید کے نتیجے میں علیحدہ ریاست حیدرآباد باقی نہیں رہی تھی اور ضلع رائچور بھی ریاست حیدرآباد سے کاٹ کر صوبہ میسور (موجودہ کرناٹک) میں شامل کر دیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم بھی چوں کہ کئی برس حیدرآباد میں رہ چکے تھے اس لیے میں نے عمداً ہی اپنے تعارف میں ریاست حیدرآباد کا حوالہ دیا تھا۔ مولانا نے دریافت فرمایا کہ میں لاہور کب پہنچا تھا؟ میں نے بتایا۔ اتنے میں مولانا کو کسی اور صاحب نے مخاطب کیا اور مولانا ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ میں خاموشی سے باتیں سنتا رہا لیکن مجھے بخوبی یاد ہے کہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مولانا گفتگو میں حصہ تو لے رہے ہیں، ان صاحب سے مخاطب ہو کر ان کی باتوں کا جواب دے رہے ہیں لیکن ذہن کسی اور طرف کچھ مصروف سا ہے۔ میرا تاثر صحیح تھا۔ مولانا نے اچانک میری طرف رخ کیا اور کہا آپ سید امین الحسن رضوی ہیں اور آپ کے مکان کا نام کوئی منزل ہے، آپ تو مجھے خط لکھتے رہے ہیں۔

رائچور میں ہمارے گھر کا نام میرے تایا مرحوم سید سعید الحسن رضوی صاحب کے نام پر سعید منزل، مشہور ہے اور ڈاک اسی پتے پر آتی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے مولانا کے حافظے اور یادداشت پر کتنا تعجب ہوا۔ کہاں مولانا کی شخصیت، ان کی بے پناہ مصروفیات اور ان کے پاس روزانہ جانے کہاں کہاں سے آنے والے متعدد خطوط اور کہاں مجھ جیسا یکسر غیر معروف انسان اور اس کے لکھے ہوئے بس چار پانچ خطوط۔ پتا نہیں کیوں مولانا کو میرا انہیں خط لکھنا اور اس حوالے سے انھیں میرا نام یاد رہ گیا۔ بہر حال یہ تھی میری مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات کی دوسری قابلِ ذکر بات۔ اس کے بعد دوسرے اصحاب سے گفتگو شروع ہو گئی پھر رفتہ رفتہ لوگ اُٹھ کر جانے لگے۔ حتیٰ کہ میں اور صرف مولانا رہ گئے۔ صحیح اور متعین طور پر تو یاد نہیں کہ مولانا سے کیا باتیں ہوئی مجملاً اتنا یاد ہے کہ مولانا نے مجھ سے ہندوستان کے حالات کے بارے میں دریافت کیا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا نے پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ داہنے ہاتھ میں لیا اور بائیں ہاتھ سے اُگالدان اٹھایا اور کھڑے ہو کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے اور مجھ سے کہا ''سید صاحب آیئے''۔ مجھے کچھ تامل ہوا کہ کیا میں نے صحیح سنا ہے اور میں چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ کھڑا

رہا پھر خیال آیا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مولانا یوں رکھائی سے بلا سلام کیے اور خدا حافظ کہے بغیر چلے جائیں اس لیے مجھے آنے کو کہا ہی ہوگا۔ یہ سوچ کر پھر بھی قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ میں مولانا کے پیچھے پیچھے چلا، چند قدم کے بعد ہی چار پانچ سیڑھیاں تھیں پھر مختصر سا برآمدہ اور اس کے بعد مولانا کا کمرہ۔ مولانا کمرے کا دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوئے تو اس وقت میں پہلی سیڑھی پر تھا۔ کمرے میں باریک جالی دار دروازہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا نے اُگالدان نیچے رکھا، پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ میز پر رکھا اور کرسیوں کو ترتیب دینے لگے۔ میں برآمدے میں ہی کھڑا تھا کہ مولانا کی آواز آئی۔ ''سید صاحب اندر آجایئے۔'' تب مجھے اطمینان ہوا کہ مولانا نے مجھ سے ہی آنے کو کہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ نیم دائرے کی شکل میں ایک بڑی سی میز ہے جس کے پیچھے مولانا کی کرسی ہے اور میز کے اطراف نیم دائرے میں کرسیاں بچھی ہوئی ہیں لیکن مولانا میز کی پیچھے والی اپنی کرسی پر نہیں بیٹھے بلکہ انھیں جن کرسیوں کو میں نے ترتیب دیتے ہوئے جالی کے باہر سے دیکھا تھا ان میں سے ایک پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک پر خود تشریف فرما ہوئے اور بڑی یگانگت سے مجھ سے باتیں شروع کردیں۔ میں ایک طرف تو اپنی خوش بختی پر مسرور تھا کہ مولانا سے ہم کلام ہوں، ساتھ ہی یہ بھی خیال ہو رہا تھا کہ مولانا کے معمولات میں مخل ہو رہا ہوں۔ بہر حال گفتگو ہوتی رہی۔ اس نوبت پر وہ تیسری بات واقع ہوئی جو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مولانا سے گفتگو ہوتے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اندرونی دروازے پر کسی نے کھٹکا کیا۔ مولانا نے قدرے بلند آواز میں کہا 'اچھا' اور پھر مجھ سے مصروف گفتگو ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کتنا وقت اور گزرا لیکن غالباً کچھ زیادہ ہی وقت ہوا ہوگا کہ اسی دروازے پر پھر کھٹکا ہوا۔ قیاس ہے کہ مولانا کی اہلیہ یا صاحبزادیوں میں سے کوئی ہوگا۔ اس پر مولانا نے پھر قدرے بلند آواز میں کہا 'اچھا آتا ہوں' اس نوبت پر معاً مجھے چودھری نذیر احمد مرحوم یاد آ گئے، انھوں نے اپنے حالات زندگی 'تلاش راہ حق' میں مولانا مودودی مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات کا جو حال لکھا ہے اس میں انھوں نے بھی کم وبیش اسی طرح کی بات لکھی ہے کہ وہ مولانا سے گفتگو کر رہے تھے اور اندرونی دروازے پر کھٹکا ہوا اور مولانا نے غالباً یہی جواب دیا کہ 'اچھا آتا ہوں' اس کے ساتھ ہی چودھری صاحب مرحوم نے یہ دلچسپ بات بھی لکھی ہے کہ چوں کہ وہ خود راجپوت گھرانے کے تھے اور وہ لوگ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھتے ہیں، اس لیے

انھوں نے کھٹکے کی آواز پر یہ سوچا کہ اگر مولانا مودودیؒ نے فوراً ان سے گفتگو ختم کردی اور اندر چلے گئے تو وہ سمجھیں گے کہ اس شخص میں قائدانہ صلاحیت کی کمی ہے۔ لیکن چوں کہ مولانا مودودیؒ 'اچھا آتا ہوں' کہہ کر پھر چودھری صاحب سے باتوں میں مصروف ہو گئے اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ آدمی دبنگ ہیں۔ چناں چہ بے ساختہ میں نے مولانا سے کہا کہ مولانا اس وقت تو مجھے چودھری نذیر احمد صاحب یاد آ گئے۔ ان کی آپ سے پہلی ملاقات میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس پر مولانا نے خاصے متاسف لہجے میں بس اتنا کہا۔ ''ہاں ہم نے چودھری صاحب مرحوم کی شکل میں اپنا ایک بہت اچھا کارکن اور رفیق کھو دیا۔'' مجھے بھی خیال ہوا کہ میں نے کافی وقت لے لیا ہے اور مولانا اپنی خوش خلقی اور میری مروت میں اپنے معمولات کو معطل کیے ہوئے ہیں اس لیے میں نے اجازت طلب کی۔ مولانا نے پوچھا پھر کب آئیں گے؟ تو میں نے کہا مجھے اور کوئی مصروفیت تو ہے نہیں فرمائیں تو کل شام کو حاضر ہو جاؤں۔ اس پر مولانا نے فرمایا اگر کوئی اور مصروفیت نہیں ہے تو کل صبح ہی آیئے اور لوگوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے کہا 'جی بہت بہتر' اور رخصت ہو گیا۔

مولانا سے میری اس ملاقات کے کوئی دس دن بعد ہی جماعت کا کل پاکستان اجتماع ہونے والا تھا۔ اس میں چوں کہ بڑی تعداد میں لوگوں کی شرکت متوقع تھی اس لیے اس کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ ایوب خاں کے اقتدار کا دور تھا اور حکومت پنجاب کے اربابِ اقتدار بھی مولانا مرحوم اور جماعتِ اسلامی کے شدید مخالف تھے اور ایک طرف تو اس وقت کے پنجاب کے وزیر داخلہ صاحب روزانہ مولانا اور جماعت کے خلاف ایک نہ ایک بیان دیتے رہتے تھے اور دوسری طرف انتظامیہ کے افسران نئی نئی رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ اجتماع کے لیے پہلے جس مقام کی درخواست دی گئی تھی اور اجازت مل بھی چکی تھی، اچانک کوئی وجہ بتائے بغیر اجتماع کی تاریخ سے چند ہی دن قبل اس سے قریب ہی ایک جگہ (١) بتائی گئی۔ یہ جگہ بہت ناہموار تھی اور اس میں بڑے بڑے گڑھے بھی تھے لیکن جماعت کے کارکن دشواریوں کی پروا کیے بغیر اس جگہ کو صاف کرنے، گڑھے بھرنے اور ممکن حد تک اس میدان کی سطح برابر کرنے کے کام میں لگ گئے۔ پھر لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی ممانعت کے احکام آ گئے۔ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے اتنے بڑے اجتماع کی

---

(١) بھاٹی گیٹ اور ٹیکسالی دروازہ کے درمیان کی جگہ

کارروائی کیسے ممکن تھی؟ جماعت نے اس حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ دائر کردی تھی۔غرض جماعت پر یہ بڑاسخت وقت تھااوراخبارات میں بھی انتظامیہ اور جماعت کے درمیان اس معرکہ کا بڑاچرچا تھا۔

میں دوسرے دن کوئی دس بجے کے قریب مولانا کے پاس گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میاں طفیل محمد صاحب جوان دنوں قیم جماعت تھے کسی کام سے مولانا کے کمرے میں آ گئے مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا اور طفیل محمد صاحب مولانا سے کچھ ضروری باتیں کر کے چلے گئے۔ پھر مولانا نے مجھ سے کہا کہ اس اجتماع میں ایک دلچسپ نمائش بھی لگائی جارہی ہے جس کا اہتمام نعیم صاحب صاحب کررہے ہیں، چاہیں ان سے جا کرمل لیں۔ میں نے بڑی خوشی سے ہامی بھرلی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اجتماع کی تیاری کے سلسلے میں اگر میں کسی کام آ سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ اس پر مولانا مسکرائے اور مزاحاً کہا کہ وزیر داخلہ صاحب روزانہ جماعت پرنت نئے الزام لگارہے ہیں،انھیں خبر ہوگی کہ ایک ہندوستانی ہمارے لیے کام کررہا ہے توانھیں بات کا بتنگڑ بنانے کا موقع ہی مل جائے گا۔ پھر کہا کہ نعیم صدیقی صاحب سے مل تو لیں انھیں کوئی ضرورت ہوگی تو بتا دیں گے۔ مولانا نے گھنٹی بجائی کوئی کارکن اندر آئے اور مولانا نے ان سے کہا کہ مجھے نعیم صدیقی صاحب کے پاس لے جائیں اور کہہ دیں کہ مولانا نے بھیجا ہے۔ اس طرح میں نعیم صدیقی صاحب کے کمرے میں پہنچا۔علیک سلیک کے بعد تعارف ہوا، میں نے مولانا مودودیؒ صاحب کے حوالے سے نمائش کے بارے میں معلوم کیا تو بتایا کہ ہاں تیاریاں تو ہورہی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ دیکھنا تو یہ ہے کہ یہ حکومت اجتماع ہونے بھی دیتی ہے یانہیں۔ میں نے دیکھا کہ نعیم صاحب بہت مصروف ہیں اور لوگ مسلسل ان کے پاس آ اور جارہے ہیں۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر چند لمحات ایسے آئے اُن کے کمرے میں کوئی نہیں آیا تو میں نے ان سے بھی کہا کہ میرے لیے کوئی خدمت ہوتو بتایئے اور ساتھ ہی مولانا مودودیؒ کی کہی ہوئی بات بھی سنادی۔ نعیم صدیقی صاحب ہنسے اور کہابات تو ٹھیک ہی ہے میں نے پھر کہا کہ مجھے ٹائپ کرنا بھی آتا ہے اگر ٹائپ کا کوئی کام ہوتو میں وہ بھی کردوں۔اس پر نعیم صاحب نے کہا پھر تو آپ ہمارے کام آسکتے ہیں اس کام کی تو ہمیں ضرورت ہے لیکن آج نہیں کل آئیں تو بتائیں گے۔اس کے بعد میں نعیم صدیقی صاحب سے اجازت لےکر گھر چلا گیا۔

پھر یہ میرا معلوم ہو گیا کہ روز صبح ۹ بجے کے قریب ۵- ذیلدار پارک چلا جاتا، چھوٹا موٹا کچھ کام جو نعیم صدیقی صاحب اور میاں محمد صاحب بتاتے وہ کر کے دو پہر میں جب کھانے اور ظہر کی نماز کے لیے جماعت کے دفاتر بند ہوتے تو گھر چلا آتا اور پھر سہ پہر میں مولانا کی عصری مجلس میں شامل ہوتا اور مغرب کی نماز کے کچھ دیر بعد گھر آجاتا لیکن سہ پہر کا جانا بالالتزام نہیں تھا، کبھی گھر والے ان کے ساتھ وقت نہ گزارنے کی شکایت کرتے تو رک جاتا۔

ایک دن صبح میں وہاں گیا تو مولانا برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے ان کے ساتھ دو نوجوان عدالتی لباس میں کھڑے تھے مجھے دیکھ کر علیک سلیک کے بعد مولانا نے ان دونوں سے میرا تعارف کرایا(۱) اور کہا رضوی صاحب آپ بھی وکیل ہیں اور ان دونوں کے ساتھ چلے جائیے آج ہائی کورٹ میں تاریخ ہے آپ یہاں کی عدالتوں کا رنگ بھی دیکھ لیجیے۔ (اجتماع میں مائیکرو فون اور لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی کے ریاستی حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں جو چارہ جوئی کی گئی تھی اس کی سماعت اس دن ہونے والی تھی) میں ان دونوں کے ساتھ کار میں ہائی کورٹ چلا گیا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ کس وجہ سے اس دن بحث نہیں ہو سکی لیکن اتنا یاد ہے کہ بعد میں جماعت کی درخواست نامنظور ہوگئی اور اجتماع کے دوران مائیکروفون کا استعمال نہیں ہوسکا۔

ان دِنوں مولانا مودودیؒ بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اس وجہ سے میں خود ان کے پاس بہت کم جاتا تھا۔ ان ہی دنوں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں میاں طفیل محمد صاحب کے پاس تھا کہ انھوں نے مجھے کوئی کام بتایا جس کے لیے مجھے مولانا کے کمرے میں جانا تھا۔ مولانا کے کمرے میں ان کی نشست کی کرسی کے پیچھے کتابوں کا ایک بڑا شیلف تھا جس میں ایک کتاب کی کئی جلدیں نمایاں نظر آتی تھیں جب بھی میں مولانا کے کمرے میں گیا تو میں نے انھیں یا تو ان میں سے کسی ایک جلد کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا اور اگر وہ کوئی اور کام یا کسی سے گفتگو کر رہے ہوتے تو اس کتاب کی کوئی جلد ان کی میز پر رکھی ہوئی پاتا تھا۔

اجتماع کا دن آگیا اور مجھے اس تاریخی اجتماع میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حکومت وقت کے شدید معاندانہ طرزِ عمل کے باوجود اس اجتماع میں پاکستان کے اس وقت کے دونوں مغربی و مشرقی حصوں سے ہزاروں مردوں اور کئی سو عورتوں نے اس میں شرکت کی۔

---

(۱) اتفاق سے ان میں سے کسی کا بھی نام مجھے اس وقت یاد نہیں ہے۔

حکومت نے عین وقت پر اجتماع کے مقام کو تبدیل کر کے ایک نہایت ناموزوں جگہ پر اجتماع کی اجازت دی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی عائد کر دی تھی اور بطورِ حربہ آخر چند غنڈوں کو روانہ کر دیا کہ وہ اجتماع گاہ میں غنڈہ گردی کریں۔ میں نے ان غنڈوں کو بڑے بڑے چاقوؤں سے طویل پنڈال کی قناتوں کی رسیاں کاٹتے ہوئے خود دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ جب وہ غنڈے رسیاں کاٹ رہے تھے تو پولیس والے ان سے چند قدم ہی کے فاصلے پر قطار باندھے بالکل خاموش کھڑے تھے۔ اسی اجتماع میں غنڈوں کے سردار نے شہ نشین کے قریب کی قنات گرا کر مولانا مودودیؒ پر پستول سے فائر کیا لیکن گولی بجائے مولانا کے ان کے ایک رفیق یوسف صاحب کو لگی وہ شہید ہو گئے۔ اسی اجتماع میں مولانا مودودیؒ سے جب کسی نے[1] ان پر گولی چلائے جانے کے امکانی خطرے کے پیشِ نظر بیٹھ جانے کو کہا تو مولانا مودودیؒ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ''میں ہی بیٹھ گیا تو کھڑا کون ہوگا۔''

لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی کے حکم سے پیدا ہونے والی دشواری کا حل اس طرح نکالا گیا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سو ڈیڑھ سو افراد ایک ایک حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور مولانا مودودیؒ کا خطبۂ صدارت ان حلقوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر مختلف اصحاب نے پڑھا۔ شہ نشین کے قریب کے حلقہ میں خود مولانا نے اسے پڑھا۔ یہاں ایک روایت نقل کر دوں۔ میں اس روایت کی صحت کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا اس لیے کہ میں نے اسے وہیں کچھ لوگوں سے سنا تھا لیکن اس کی تصدیق خود مولانا سے نہیں کر سکا۔ روایت یہ ہے کہ پنجاب کے اس وقت کے گورنر نواب کالا باغ نے (جن کا چند سال قبل انتقال ہو گیا) اپنی جاگیر کالا باغ سے اجتماع کے دوسرے دن کی کارروائی میں گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے کچھ غنڈے بلوائے۔ جماعت کے کارکنوں کو اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے اس ٹرک کا نمبر بھی حاصل کر لیا جس میں یہ غنڈے آئے تھے اور غنڈوں کی صحیح تعداد اور کچھ کے نام بھی معلوم کر لیے۔ اطلاع یہ بھی تھی کہ ان غنڈوں کا ہدف خواتین کا کیمپ ہوگا۔ ان تفصیلات سے مولانا مودودیؒ کو مطلع کر دیا گیا۔ اس پر مولانا نے خود نواب کالا باغ کو ٹیلی فون کیا اور بڑے سخت لہجہ میں ان سے کہا کہ غنڈوں کو بلائے جانے کی پوری تفصیل ان کے علم میں آ گئی ہے اور اگر دوسرے دن بھی اجتماع میں غنڈہ گردی کی گئی اور اس کے نتیجے میں پورا لاہور جہنم

---

(۱) چودھری غلام جیلانیؒ مدیر ایشیا لاہور

بن گیا تو اس کی پوری ذمے داری ان (نواب کالا باغ) پر ہوگی۔[1] یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو لیکن بہر حال یہ واقعہ ہے کہ دوسرے دن اجتماع میں کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اجتماع ۲۵ تا ۲۷/اکتوبر ۱۹۶۳ کو ہوا تھا۔

اجتماع کے تین چار دن بعد ایک صبح میں دفتر جماعت گیا تو دیکھا کہ ایک کار میں پیچھے کی نشست پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور مولانا مودودیؒ خود آگے ڈرائیور کے برابر بس بیٹھنے ہی والے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہا وہ قلعہ گوجر سنگھ جا رہے ہیں اگر میں بھی چلنا چاہوں تو دوسری گاڑی میں آ جاؤں۔ میں نے کہا 'جی آ جاؤں گا۔' مولانا تشریف لے گئے اور کوئی پندرہ بیس منٹ بعد دوسری گاڑی میں چند اصحاب کے ساتھ میں بھی چلا گیا۔ قلعہ گوجر سنگھ لاہور میں اچھرہ سے خاصی دور ایک محلّہ ہے اور وہاں ایک عمارت میں مولانا درس حدیث دیا کرتے تھے (یہ خیال نہیں کہ یہ درس ہر ہفتہ ہوتا تھا یا پندرہ دن میں یا مہینہ میں ایک دفعہ) ہم لوگ جب وہاں پہنچے ہیں تو درس شروع ہو چکا تھا۔ موٹر کچھ فاصلے پر چھوڑ کر ہم لوگ پیدل اس عمارت تک گئے جس میں مولانا درس دے رہے تھے۔ اس مختصر سے راستے کا منظر بڑا دلکش تھا راستے کے دونوں طرف مکانوں اور دوکانوں کے چبوترے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ چھتوں پر بڑی تعداد میں خواتین بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور لوگ بڑے سکون اور خاموشی سے درس سن رہے تھے۔

کچھ دن اور لاہور میں رہ کر میں کراچی چلا گیا، جہاں میرے بہت سے رشتہ دار اور کئی دوست تھے اور وہاں میں زیادہ دن رہنے والا تھا۔ کراچی کے دورانِ قیام میں نے ایک دن اخبار میں دیکھا کسی بیرونی سفر پر جانے کے لیے مولانا مودودیؒ اس دن کراچی پہنچ رہے ہیں اور اسی دن سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ میں نے معلومات کیں کہ مولانا کہاں ٹھیریں گے اور ان سے ملنے کے لیے وہاں چلا گیا۔ میرے ایک کم عمر عم زاد بھائی خالد رضوی نے خواہش کی کہ میں انھیں بھی ساتھ لے چلوں اور ان کی آٹوگراف بک پر مولانا کا آٹوگراف دلوا دوں، ہم دونوں وہاں گئے۔ اس وقت مولانا موجود نہیں تھے، صاحب خانہ نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مشروبات سے تواضع کی۔ کچھ دیر بعد مولانا آ گئے۔ انھیں فوراً ہی ایرپورٹ کے لیے روانہ ہونا

---

(۱) مجھ سے جن صاحبان نے یہ روایت کی انھوں نے مولانا کے یہی الفاظ نقل کیے۔ نواب کالا باغ کا نام امیر محمد خاں تھا لیکن وہ عام طور پر نواب کالا باغ ہی کہلاتے تھے۔

تھا۔ مختصر سی ملاقات رہی اور میرے کہنے پر مولانا نے از راہِ عنایت میرے بھائی خالد کی آٹو گراف پر دستخط کیے اور میری مزید گزارش پر ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا بھی دی۔

مولانا مودودیؒ سے دوسری ملاقات

یکم اگست ۶۴ء کو میں بمبئی سے بحری جہاز (T.V. Roma) کے ذریعہ لندن کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں سے اگست ۶۵ء میں واپس ہوا۔ میں نے واپسی کا پورا سفر خشکی کے راستے سے کیا۔ میونخ (جرمنی) سے استنبول تک جانے والی کانٹی نینٹل ایکسپریس میں سفر شروع کیا اور چوں کہ بڑا سوٹ کیس میں نے استنبول کے لیے بک کرایا تھا اور میرے ساتھ صرف ایک اٹیچی تھی اور راستہ میں پڑنے والے تمام ملکوں کا ویزا بھی میں نے لے رکھا تھا اس لیے راستہ میں سفر منقطع کر کے مختلف شہروں میں گھومتا ہوا کوئی ہفتہ بھر بعد استنبول پہنچا۔ استنبول سے تہران تک ایک پسنجر بس میں سفر کیا۔ پاکستان کے ویزا کے لیے لندن میں پاکستانی سفارت خانے نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کراچی کو لکھ رہے ہیں (ان دنوں اسلام آباد دارالحکومت نہیں بنا تھا) اور میرے تہران پہنچنے تک وہاں کے پاکستانی سفارت خانے میں جواب آچکا ہوگا سوچا کہ اگر ویزا کی منظوری آ گئی ہو تو وہاں سے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگوالوں اور اگر منظوری نہ ملی ہو تو پھر مجھے تہران سے ہوائی جہاز کے ذریعہ بہ راہِ راست ہندوستان جانا ہوگا۔ ہندوستان سے تعلقات کشیدہ ہونے کے باعث پاکستانی سفارت خانوں کو ہندوستانیوں کے لیے بہ طور خود ویزا دینے کا اختیار نہ تھا بلکہ کراچی کو کارروائی بھیجی جاتی تھی اور وہاں سے اجازت ملنے پر ویزا دیا جاتا تھا۔ تہران پہنچ کر میں پاکستانی سفارت خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ اللہ کے فضل سے ویزا کی منظوری آگئی ہے لیکن چوں کہ میں ہندوستانی تھا اس لیے مجھے درّۂ خیبر جیسے فوجی اہمیت کے علاوہ سے گزرنے دینا خلاف احتیاط سمجھا گیا، اس لیے میرے ویزا میں صراحت تھی کہ پاکستان میں صرف بحری یا فضائی راستے سے داخل ہوسکتا ہوں۔ اس بنا پر میں نے پروگرام بنایا کہ افغانستان کے دارالحکومت کابل تک بس میں جاؤں گا اور وہاں سے پشاور تک ہوائی جہاز سے اور پھر لاہور تک ریل سے جہاں مولانا مودودیؒ سے دوبارہ ملاقات کی سعادت حاصل کروں گا۔ اپنے اس سفر کی تفصیل بیان کرنے کی ایک وجہ ہے جو میں آگے عرض کروں گا۔

پاکستان کا ویزا حاصل کر کے میں نے تہران میں کچھ دنوں قیام کیا اور پھر بس کے ذریعہ سے ایران اور افغانستان کے ایک سرحدی قبصہ کے لیے روانہ ہو گیا وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ افغانستان میں کالرا پھیلا ہوا ہے اس لیے وہاں سے افغانستان کے سفر پر پابندی لگا دی گئی ہے اور افغانستان سے آنے والوں کو اسی قصبہ میں کچھ دنوں کے لیے قرنطینہ (Quarntine) کیمپ میں رکھا جاتا ہے۔ مجبوراً اس قصبہ میں رکنا پڑا اور کوئی ایک ہفتہ بعد سفر کی اجازت ملی تو میں بس کے ذریعہ کابل کے لیے روانہ ہوا اور وہاں چند دنوں قیام کر کے ہوائی جہاز سے پشاور اور وہاں سے ٹرین کے ذریعہ لاہور چلا گیا۔

اوپر میں نے اپنے لندن سے لاہور تک کے سفر کی جو روداد بیان کی ہے وہ دراصل یہ بتانے کے لیے کی ہے کہ میں لندن سے روانہ ہوتے ہی کوائف عالم سے بے خبر ہو گیا تھا۔ میونخ میں جو دو تین دن میں رہا تو گو مجھے ٹوٹی پھوٹی جرمن زبان آتی تھی۔ (جو میں نے ڈوسلڈارف میں چند ماہ کے دوران قیام سیکھ لی تھی) لیکن جرمن زبان میں اخبار پڑھنا نہ تو میرے بس میں تھا اور نہ اخبار پڑھنے کا داعیہ ہی میرے اندر پیدا ہوا۔ یہی حال میرے استنبول تک مختلف ملکوں کی سیر و تفریح کے دوران رہا اور پھر تہران سے کابل تک بھی۔ فارسی، وہ بھی قدیم گلستاں بوستاں والی مجھے اچھی خاصی آتی تھی لیکن جن ملکوں میں میرا رکنا ہوا ان میں سے کسی بھی ملک کی زبان مجھے ذرا سی بھی نہیں آتی تھی اس لیے اخبارات کے پڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں خود بھی دنیا کے حالات سے یکسر بے خبر رہنے کی کیفیت کا تجربہ کرنا چاہتا تھا چناں چہ میں لندن سے اپنی روانگی سے لے کر کابل پہنچنے تک تقریباً ایک ماہ کے عرصے میں دنیا کے حالات سے بالکل ناواقف رہا۔ وہ تو جب میں کابل سے پشاور جانے کے لیے پی۔ آئی۔ اے کے ہوائی جہاز میں سوار ہوا اور ایر ہوسٹس نے اخبار لا کر دیا تو اسے دیکھ کر پتا چلا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان شدید فوجی جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ جب میں لندن سے چلا تھا تو مطلع معمول کے مطابق تھا۔

لاہور میں مولانا مودودیؒ سے اپنی اس دوسری ملاقات کی رواداری کی چند قابل ذکر باتیں عرض کرتا ہوں۔ میں جب استنبول کو روانگی سے قبل میونخ میں تھا تو ایک دن بازار میں یوں ہی گھوم رہا تھا کہ مجھے چند خواتین اور مردوں پر مشتمل سکھوں کا ایک گروپ نظر آیا جو نووارد اور کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو انھیں دیکھتا رہا پھر ہم وطنی کے رشتے سے ان کے پاس جا کر

بتایا کہ میں بھی ہندوستانی ہوں اور چوں کہ جرمنی کے ملک اور جرمن زبان دونوں سے واقفیت ہے اس لیے اگر میں ان کی کچھ مدد کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور اپنی ضرورتوں سے آگاہ کیا۔ جن میں سے ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ ان کے گروپ کی ایک خاتون بیمار ہوگئی تھیں اور انھیں طبی امداد کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ لندن جارہے تھے۔ میں نے ان کی ضرورتیں پوری کرنے میں حتی الامکان ان کی مدد کی۔ انھیں معلوم ہوا کہ میں تہران بھی جاؤں گا تو انھوں نے بتایا کہ وہ لوگ تہران سے ہی آ رہے ہیں اور یہ کہ تہران میں سکھوں کے گردوارہ کے جو منتظم ہیں وہ ان کے قریبی عزیز ہیں۔ گردوارہ سے ملحق ایک مہمان خانہ (گیسٹ ہاؤس) بھی ہے۔ میں وہاں قیام کروں۔ مجھے ان لوگوں نے تہران والے اپنے عزیز کے نام ایک تعارفی خط بھی دیا۔ میں تہران آ کر ان سردار جی سے ملا۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ ان کی موٹر کے کل پرزوں (Motor Parts) کی دکان تھی جو خیابان امیر کبیر میں واقع تھی۔ موصوف نے بڑی خوش دلی سے میرا استقبال کیا اور رات کو دوکان بند کر کے مجھے اپنے ساتھ گردوارہ کو لے گئے اور مہمان خانے میں میرے قیام کا انتظام کر دیا۔ وہاں جب عشا کا وقت ہوا میں نے غسل خانے میں جا کر وضو کیا لیکن نماز کے لیے کھڑا ہونے سے قبل خیال ہوا کہ پتا نہیں یہاں نماز پڑھنی درست بھی ہوگی یا نہیں۔ کچھ دیر سوچتا رہا لیکن کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تو احتیاطاً یہی بہتر معلوم ہوا کہ وہاں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ چناں چہ میں جانماز لے کر گردوارہ کے کمپاؤنڈ کے باہر چلا گیا اور وہاں ایک گھاس کے قطعہ پر نماز پڑھی۔ پھر جتنے دن میں تہران میں رہا تو چوں کہ نماز فجر اور عشا کے وقت گردوارہ کے مہمان خانے میں ہوتا تھا اس لیے اس سارے عرصہ میں یہ نمازیں گردوارہ کے کمپاؤنڈ کے باہر ہی پڑھتا رہا۔

لاہور میں مولانا مودودیؒ سے میں نے اس کا تذکرہ کیا اور مسئلہ معلوم کیا۔ مولانا نے جواب دیا جو مجھے اچھی طرح یاد ہے اور خاص کر اس وجہ سے بھی کہ مولانا نے اپنے جواب میں عربی کی ایک اصطلاح استعمال کر کے اس کا انگریزی ترجمہ بھی بیان فرمایا تھا۔ مولانا نے فرمایا چوں کہ ایران کو اصلاً مسلمانوں نے بالقوۃ (By operation of War) فتح کیا تھا اس لیے مملکت ایران میں غیر مسلموں کے معابد میں بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

دوسرا قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ لندن میں کچھ دن قیام کر کے میں ڈوسلڈارف

(جرمنی) کچھ دنوں کے لیے چلا گیا تھا، وہاں مجھے کافی فرصت تھی اور تفہیم القرآن کی جلدیں میرے ساتھ تھیں۔ اس وقت تک تفہیم القرآن کی تین جلدیں ہی طبع ہوئی تھیں اور میری لندن کو روانگی سے قبل رائچور کی جماعت اسلامی کے رفقا کی طرف سے ایک الوداعی تقریب میں مولانا سراج الحسن صاحب (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) نے مجھے یہ تین جلدیں تحفۃً عنایت فرمائی تھیں۔ مجھے خیال ہوا کہ کیوں نہ میں فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تفہیم القرآن کا انگریزی میں ترجمہ شروع کردوں۔ لیکن سورۃ البقرہ کا ترجمہ بھی مکمل نہ کر پایا تھا کہ میں لندن واپس چلا گیا اور وہاں بیمار ہو گیا۔ میرا ULCAR کا آپریشن ہوا۔ اور صحت مند ہونے کے بعد میں ہندوستان روانہ ہو گیا۔

لاہور پہنچ کر میں عصر کے وقت مولانا سے ملنے گیا اور عصری مجلس میں شریک رہا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ مولانا کے دائیں طرف والی کرسیوں کی قطار میں تیسری یا چوتھی کرسی پر نکلتے ہوئے قد کے ایک صاحب بیٹھے تھے جو لمبا کرتا اور تنگ پائینچوں کی شلوار پہنے ہوئے تھے اور ان کی گود میں ایک گٹھر سا تھا۔ یہ صاحب گفتگو میں بھی کوئی حصہ نہیں لے رہے تھے۔ میں سمجھا کوئی دیہاتی ہیں جو عقیدۃً مولانا کی محفل میں حاضر ہو گئے ہیں۔ دورانِ گفتگو میں نے مولانا کو بتایا کہ میں نے تفہیم القرآن کا انگریزی میں ترجمہ شروع کر دیا ہے اور خواہش کی کہ مولانا دعا فرمائیں کہ میں اس کام کو بحسن وخوبی پورا کرسکوں۔ مولانا نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا! آپ بھی ترجمہ کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ چودھری اکبر صاحب ہیں یہ بھی ترجمہ کر رہے ہیں! یہ کہہ کر مولانا ان ہی صاحب سے مخاطب ہوئے جنھیں میں اپنی حماقت سے ایک ان پڑھ دیہاتی سمجھ رہا تھا اور دریافت کیا کہیے چودھری صاحب کہاں تک ہو چکا ہے ترجمہ! میں ذہنی طور پر کس درجہ شرمندہ ہوا ہوں گا اس کا اندازہ کرنا کچھ بھی دشوار نہیں۔

تیسری بات یہ ہوئی کہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آویزش ختم ہو کر حالات معمول پر نہیں آجاتے میں لاہور ہی میں رہوں گا اور مولانا سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن تیسرے دن جب میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ مناسب یہی ہے کہ میں جلد از جلد ہندستان واپس چلا جاؤں۔ مولانا نے یہ بات محض مشورۃً نہیں کہی بلکہ میں نے ان کے لہجہ میں نمایاں طور پر اصرار بھی محسوس کیا، چناں چہ میں نے عرض کیا

کہ میں دوسرے ہی دن چلا جاؤں گا۔ مولانا نے فرمایا کہ اسٹیشن جاتے ہوئے میں ان سے ملتا ہوا جاؤں۔ دوسرے دن اسٹیشن جاتے ہوئے میں ان کے پاس گیا تو مولانا نے تفہیم القرآن کی جلد اول مجھے دی اور فرمایا کہ نظر ثانی کے بعد اس میں انھوں نے کچھ حذف و اضافہ کیا ہے جو متعلقہ مقامات پر قلم سے درج ہے، میں یہ جلد مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی کو پہنچادوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بہ عجلت ہندوستان چلے جانے کا مشورہ مولانا نے اپنی بصیرت سے دیا تھا یا انھیں کسی طرح حکومت کی اس اسکیم کا علم ہوگیا تھا کہ جتنے ہندوستانی اس وقت لاہور میں تھے حکومت انھیں حالتِ جنگ کے باعث بہ طور احتیاط نظر بند کرنے والی تھی۔ ہندوستان پہنچنے پر میں نے اخبارات میں پڑھا کہ میری لاہور سے روانگی کے دو تین دن کے بعد ہی لاہور میں مقیم تمام ہندوستانی نظر بند کردیے گئے۔

میں لاہور سے واپسی میں دیوبند میں مولانا عامر عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہوا دہلی آیا اور یہاں مولانا مودودیؒ کی امانت تفہیم القرآن کی جلد اول مکتبہ جماعت اسلامی کو پہنچا کر دو تین دن مولانا ابو اللیث صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ امیر جماعت اسلامی ہند کے پاس مرکز جماعت میں رہا۔ (ان دنوں مرکز جماعت سوئی والان دہلی میں تھا) اور پھر اپنے گھر رائچور چلا گیا اور دوسرے ہی دن کل ہند مسلم مجلس مشاورت کی شاخ کرناٹک کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں شرکت کے لیے بنگلور چلا گیا وہاں سے واپس آتے ہی اسی دن مجھے احتیاطی نظر بندی کے تحت گرفتار کرکے داخل زنداں کر دیا گیا جب کہ وہ ہندوستانی جن کو لاہور میں نظر بند کیا گیا تھا انھیں وہاں کی حکومت نے آرام سے اچھے ہوٹلوں میں رکھا اور بالآخر جب جنگ بندی کے بعد وہ لوگ رہائی پا کر ہندوستان آئے تو یہاں ان کی عمدہ پذیرائی بھی ہوئی۔ میں بھی اگر وہیں رک گیا ہوتا تو اسیری و زندانی کی خواری سے تو بچ جاتا لیکن مولانا سراج الحسن صاحب سابق امیر جماعت اسلامی ہند اور جناب محمد جعفر صاحب (موجودہ معاون امیر حلقہ جماعت اسلامی حلقہ کرناٹک) کی یادگار صحبت جو رائچور اور بیجاپور کی جیلوں میں تقریباً چار مہینوں تک حاصل رہی اس سے محروم رہ گیا ہوتا۔

مولانا مودودیؒ سے تیسری ملاقات

مولانا مودودیؒ سے میری تیسری ملاقات ۲؍جولائی ۱۹۷۸ کو ہوئی۔ جولائی ۱۹۷۸ میں کراچی میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ میں ان دنوں ہفتہ وار ریڈینس کا ایڈیٹر تھا۔ مجھے اس کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ وصول ہوا۔ میں نے ریل سے لاہور جانے کا فیصلہ کیا، میری اہلیہ بھی ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر تھے مع اپنی اہلیہ اور بچوں کے ہم سفر رہے۔ یکم جولائی کو ہم لوگ لاہور پہنچے اور میں اور اہلیہ اپنے عزیزوں کے گھر اے۔ ایف ماڈل ٹاؤن چلے گئے۔ دوسرے دن سہ پہر کو میں اپنی اہلیہ کے ساتھ مولانا مودودیؒ کے گھر گیا۔ مولانا مودودیؒ اپنے اسٹڈی روم میں اپنے مطالعے کی کرسی پر نہیں بلکہ دروازے سے بائیں طرف ایک کرسی پر تشریف فرما تھے اور ٹانگ میں چوں کہ تکلیف تھی اس لیے ایک ٹانگ دوسری کرسی پر رکھے ہوئے تھے۔ بہت محبت سے ملے اور اُٹھ نہ سکنے کی معذرت کی۔ میں نے اہلیہ کا سلام کہا۔ بڑی محبت سے جواب دیا اور سامنے رکھے ہوئی گھنٹی بجائی۔ کچھ ہی دیر بعد اندرونی دروازے پر کھٹکا ہوا کہ مولانا کی طلب پر کوئی دروازے کے اس طرف آ گیا ہے اور ہدایت کا منتظر ہے۔ مولانا نے فرمایا۔ ’’ہندوستان سے رضوی صاحب کی اہلیہ آئی ہیں اور اندر آ رہی ہیں۔‘‘ میری اہلیہ بھی اشارہ پا کر اُٹھ کر اسی دروازے سے ہوتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئیں۔ میں مغرب کے وقت تک مولانا سے باتیں کرتا رہا۔ بعد کو میری اہلیہ نے بتایا کہ مولانا کی اہلیہ بھی ان سے بہت محبت سے ملیں اور کہا کہ دوسرے دن ماڈل ٹاؤن کے علاقہ میں ہی کسی کلب کی عمارت میں خواتین کا اجتماع ہے، اس میں آئیں، چناں چہ دوسرے دن میری اہلیہ وہاں گئیں تو مولانا کی اہلیہ نے ان کا تعارف دوسری خواتین سے کرایا اور مولانا کی اہلیہ کی نگرانی میں تفہیم القرآن کا اجتماعی مطالعہ ہوا۔ مولانا نے اپنے خط نمبر ۱۸ میں میری اہلیہ کو جو اپنا اور اپنی اہلیہ صاحبہ کا سلام لکھا ہے اس کی تقریب یہی ہے۔

مولانا مودودیؒ کے دریافت فرمانے پر میں نے بتایا کہ کراچی سے میری واپسی بھی براہِ لاہور ہوگی تو مولانا نے ازراہِ عنایت پیش کش فرمائی کہ کراچی سے واپسی میں میری اہلیہ اور میں ایک وقت کا کھانا ان کے گھر کھائیں۔ مجھے مولانا کی خوش ذوقی کے سلسلہ میں کہیں یہ پڑھا ہوا یاد

تھا کہ مولانا کے گھر ماش کی دال بہت لذیذ پکتی ہے چناں چہ میں نے بے تکلف مولانا سے کہہ دیا کہ ان کے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت اس شرط پر قبول کہ کھانے میں ماش کی دال ضرور ہو۔ مولانا بہت محظوظ ہوئے اور کہا ''منظور۔'' خط ۱۹ میں اسی کا حوالہ ہے۔

میری بدنصیبی کہ جب میں اور اہلیہ کراچی سے لاہور واپس ہوئے تو زبردست بارش ہونے لگی، جس کا سلسلہ دوسرے دن صبح دیر تک جاری رہا۔ اسی دن ہمیں لاہور سے ہندوستان کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے ہم دونوں بارش کے رکتے ہی اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگئے اور مولانا مودودیؒ کے تعلق سے دوسری بہت سی حسرتوں کے ساتھ ہم طعامی کی حسرت بھی۔ ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' کے مصداق ہوکر رہ گئی اور کچھ ماہ بعد ہی مولانا علاج کے لیے امریکہ تشریف لے گئے جہاں ان کا انتقال ہوگیا۔

☆☆

اب کچھ ان خطوط کے بارے میں جو آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان خطوط کی اشاعت کا مقصد اصلاً مولانا مودودی رحمہ اللہ سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار ہے۔ اس لیے کہ مولانا مودودیؒ کی غیر معمولی خدمات اور دین کی راہ میں ان کی استقامت کی وجہ سے مجھے اُن سے گہری عقیدت ہے۔ میں اپنے نام ان خطوط کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اس مجموعہ کو شائع کرنے کی تحریک اس سبب سے بھی ہوئی کہ جہاں مولانا مودودیؒ کے یہ خطوط میری بے مصرف زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں جو محض مولانا رحمہ اللہ کی اعلیٰ ظرفی کے باعث مجھے حاصل ہوگیا ہے وہیں میرا یہ بھی احساس ہے کہ مولانا مودودیؒ کے وہ لاکھوں اردوداں عقیدت مند جو ہندوستان و پاکستان کے علاوہ اب دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں وہ سب ہی مولانا کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات جاننے کے حد درجہ مشتاق رہتے ہیں۔ میرے نام ان خطوط کے آئینے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصویر چند ایسے زاویوں سے سامنے آتی ہے جن سے مولانا کی شخصیت کی معروف دلکشی و عظمت نئے رخوں سے اجاگر ہوتی ہے۔

میں ان خطوط کو اکثر پڑھتا رہتا ہوں اور جو لذت و سرور مجھے ان کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے میں اس لذت و سرور میں مولانا کے تمام عقیدت مندوں کو شامل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا کا ہر خط میرے ہی کسی نہ کسی خط کے جواب میں ہے انھوں نے از خود مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ لیکن یہ مولانا کی عظمت ہی کی دلیل ہے کہ انھوں نے میرے ہر خط کا جواب دیا حالاں کہ شروع کے ۴-۵ خط تو مولانا نے مجھے اس زمانے میں لکھے جب مولانا سے میری شخصی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں جنوبی ہند کے ایک چھوٹے شہر میں رہتا تھا اور میری جو کچھ بھی چھوٹی موٹی مجلسی حیثیت تھی وہ بس میرے مولد رائچور تک ہی محدود تھی۔ اس کے باوجود مولانا نے میرے ہر ایک خط کا جواب دینے کے لیے وقت نکالا اور حد یہ ہے کہ میری تنقیدوں کو بھی خوش دلی سے انگیز کیا۔ خط نمبر۲ تو بار بار مطالعہ کے لائق ہے، جن لوگوں نے شیخ احمد صاحب کی کتاب 'مولانا مودودیؒ اور تصوف' پڑھی ہے انھیں تو یہ خط بے اختیار اس کتاب کی یاد دلائے گا اور وہ ذہنی طور پر اس خط کو اس کتاب کے ضمیمے کی حیثیت سے قبول کریں گے۔

میں چوں کہ اپنے خطوط کی نقل رکھنے کا عادی نہیں رہا ہوں اس لیے میں نے اپنے حافظے اور مولانا کے خطوط کی عبارت کی مدد سے مولانا کے بعض خطوط کی تقریب ان خطوط کے ساتھ بیان کر دی ہے اور چند خطوط ایسے ہیں، جن کے بارے میں مجھے بالکل یاد نہیں کہ وہ میرے کس مضمون کے جواب میں ہیں۔ اس کا اظہار بھی میں نے ہر ایسے خط کے ساتھ کر دیا ہے۔

ان میں خط نمبر ا اور خط ٦ وہ ہیں جن کی اصل میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ ہوا یوں کہ ایک صاحب میرے پاس سے مولانا کے یہ خطوط مانگ کر لے گئے اس پیش کش کے ساتھ کہ وہ ان خطوں کی ایک نقل خود رکھ لیں گے اور ایک زائد نقل میرے لیے بھی کر دیں گے یہ کئی برس پرانی بات ہے جب کہ فوٹو اسٹیٹ مشینوں کا رواج ہندوستان میں عام نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب یہ خطوط اور ان کی نقول انھوں نے مجھے واپس کیں تو ان میں یہ دونوں اصل خط نہیں تھے صرف ان کی نقلیں تھیں۔ اس وقت میں نے بھی چیک نہیں کیا۔ غالباً ان صاحب کے پاس سے ہی وہ اصل خط غائب ہو گئے۔ خط نمبر٦ کی نقل بھی مکمل نہیں ہے اس خط کے آخر میں اپنے دستخط کے نیچے مولانا مودودیؒ نے عربی کے دو اشعار تحریر کیے تھے۔ نقل کرتے ہوئے ان صاحب نے وہ دونوں اشعار بھی چھوڑ دیے اور اس طرح اس خط کا ایک اہم اور مفید جز ضائع ہو گیا۔

مولانا کو ایک اور خط میں نے تریپولی (لیبیا) سے لکھا تھا۔ میں ۱۹۷۳ میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لیبیا گیا تھا۔ کانفرنس میں مولانا کے صاحبزادے فاروق مودودی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے مولانا کے نام انھیں ایک خط دیا، کچھ ہی دنوں بعد فاروق مودودی صاحب کا خط میرے پاس آیا، جس میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ انھوں نے میرا خط اپنے والد صاحب کو پہنچا دیا ہے اور وہ عنقریب اس کا جواب دیں گے۔ فاروق مودودیؒ صاحب کے اس خط کے تین، چار دن بعد ہی خود مولانا کی طرف سے میرے خط کا جواب آ گیا۔ افسوس ہے کہ مولانا کا وہ خط بھی میرے پاس محفوظ نہیں رہا ہے۔

ان خطوط میں صرف خط نمبر ۲ پوسٹ کارڈ پر ہے۔ باقی خطوط میں میرے ہانگ کانگ اور لندن کے پتے پر آئے ہوئے تمام خط ایروگرام پر ہیں، دہلی کے پتے پر صرف ایک خط (نمبر ۱۶) ایروگرام پر ہے۔ باقی سب خط لفافے میں آئے تھے۔ ان خطوں میں صرف خط نمبر ۱۰ ایسا ہے، جس پر نشان حوالہ اور تاریخ درج نہیں ہے جب کہ بقیہ تمام خطوط پر ان کا التزام ہے۔

میں تحریک اسلامی کے معروف عالم دین و مصنف حضرت مولانا سید جلال الدین عمری کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر زیر نظر کتاب کا مسوّدہ پڑھا اور پیش لفظ کی صورت میں گراں قدر رائے تحریر فرمائی۔

میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس کے تعاون سے مولانا کے ان خطوط کے مجموعے کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔

سید امین الحسن رضوی
۱۲۵۴-محلّہ محل سرائے، بلی ماران
دہلی-۱۱۰۰۰۶

شخصیت کی چند جھلکیاں

وہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جن کے خطوط آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے کیسی متنوع صفات کے حامل تھے اس کی چند جھلکیاں دیکھیے۔

علم

مولانا امین احسن اصلاحی جو مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ممتاز شاگرد، قرآن کے فراہی مکتبِ فکر کے علم بردار، اور متعدد معیاری تصنیفات کے علاوہ تفسیر 'تدبر قرآن' کے بھی مصنف ہیں۔ مولانا مودودیؒ کے علم ومطالعہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا مودودیؒ کا علم ومطالعہ بھی مدرسی اور خانقاہی حلقوں میں اکثر زیر بحث رہا ہے اور میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ اس معاملے میں لوگوں کا غرورِ علم اکثر اعترافِ حق پر غالب رہا ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحبؒ نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے لیکن میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، نہایت قابل شخص ہیں اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اس پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم وافکار پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اور ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت پر گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ قرآن کا انھوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں۔ وہ صرف بیضاوی اور جلالین بقدرِ نصاب پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں بلکہ انھوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف بہ حرف نہایت غور وفکر سے پڑھا ہے۔ صرف ان کے 'دورہ' پر اکتفا نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح فقہ، اصول، سیرت اور رجال کی تمام

ضروری کتابیں ان کی نگاہوں سے گزری ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعے کا طریقہ بھی محققانہ ہے۔ میں نے نہایت قریب سے ان کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں، کس طرح پڑھتے ہیں اور کس قدر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے صرف جیل کے قیام کے دوران علوم وفنون کے سوا تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور رجال کی اتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے کہ میں پورے اطمینان کے ساتھ کہتا ہوں کہ جو حضرات ان کے مطالعۂ کتاب وسنت پر بہ اندازِ استخفاف تبصرہ فرماتے ہیں ان کو مدت العمر اتنی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوگی۔ میں نے جب بھی ان کی پڑھی ہوئی کتاب کسی ضرورت سے اُٹھائی تو حدیث اور فقہ کی موٹی موٹی کتابوں پر دیکھا ہے کہ ان کے اہم یا قابلِ تنقید مقامات پر حاشیہ میں خود ان کے قلم سے مفید نوٹ موجود ہیں۔ وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں حاطب اللیلوں کی طرح ہوائی تیر تُکّے نہیں چلاتے۔ جیل کے دوران قیام مجھے بعض اوقات عربی کی بعض مشکل یا غلط چھپی ہوئی عبارتوں کے بارے میں ان کے مشورے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے اور میں نے ہر مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ عبارت کا تجزیہ کرنے اور کلام کی نحوی تالیفات کو سمجھنے میں مدرسی مولویوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔''

خدمتِ دین

تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۵۷ میں سرگودھا (پاکستان) کے ایک صاحب نے ظہور مہدی کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد سے سوال کیا اور اس مسئلہ پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب کی جو رائے تھی اس کا حوالہ بھی دیا۔ جواب میں مولانا آزاد نے نفس مسئلہ پر رائے دینے سے احتراز و معذرت کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کے بارے میں اپنے خط مورخہ ۱۱/اپریل ۱۹۵۷ میں لکھا:

''مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی خدمات جلیلہ سے امت مسلمہ کبھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو تجدید اسلام کے ہر باب و فصل کے لیے سرمایۂ افتخار و بدرجہ عنوان ہیں۔ مولانا گلشن حق کے ان لالہ و سنبل میں سے ہیں، جن کی خوشبو سدابہار اور تعفنِ باطل کو مغلوب کر کے طالبانِ حق کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہتی ہے اور جسے فنا نہیں۔''

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عزیمت

۱۹۵۳ میں جب لاہور کی فوجی عدالت نے اپنے ایک یکسر جاہلانہ اور نمایاں طور پر جانب دارانہ فیصلے کے ذریعے مولانا مودودیؒ کے خلاف موت کی سزا صادر کی تو مولانا کے مشیران قانونی نے ایک درخواست رحم (Mercy Petition) تیار کی، جس میں حکومت سے استدعا کی گئی تھی کہ مولانا کی موت کی سزا موقوف کر کے اسے سزائے قید میں بدل دیا جائے۔ اصل میں یہ درخواست حکومت کے ایما سے ہی تیار کی گئی تھی اس لیے کہ اس سزائے موت پر پورے پاکستان میں سخت اضطراب پیدا ہوا تھا اور بیرونِ پاکستان متعدد ملکوں میں بھی مسلمان اس فیصلے پر برہم تھے اور پاکستان کے اس وقت کا حکمراں ٹولہ اپنے میں یہ ہمت نہیں پا رہا تھا کہ مولانا کو پھانسی دے ہی دے اس لیے اس نے چاہا کہ اس طرح ایک رحم کی درخواست آ جائے تو اس بہانے وہ اس پریشان کن صورت حال سے نجات پا جائے گی۔

جیل میں جب اس درخواست کی بابت مولانا مودودیؒ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے ایسی کسی درخواست پر دستخط کرنے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ ان کا ضمیر بالکل مطمئن ہے کہ انھوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور یہ کہ ظالم سے وہ کسی حال میں رحم کی درخواست نہیں کریں گے اور نہایت سختی سے منع کیا کہ ان کے اہل خاندان کی طرف سے ایسی کوئی درخواست پیش نہ ہو۔

توکل علی اللہ

پھانسی دیے جانے کی مقررہ تاریخ سے دو تین دن قبل جب ان کے صاحبزادے فاروق مودودیؒ ان سے ملنے کے لیے گئے اور مل کر فطری طور پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تو

مولانا نے پھانسی دیے جانے والے قیدیوں کی مخصوص کوٹھری کی سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال کر فاروق مودودیؒ صاحب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''بیٹا اگر اللہ کے ہاں میرا وقت آ گیا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے پھانسی سے نہیں بچا سکتی اور اگر اللہ کی مرضی نہیں ہے تو چاہے یہ لوگ اُلٹے لٹک جائیں مجھے پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے۔''

انکسار

۱۹۴۴ میں قرآن کی مشہور زمانہ تفسیر 'تفہیم القرآن' لکھنی شروع کی تو آغاز کار میں اپنے ماہنامے 'ترجمان القرآن' میں لکھا:

''میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ مجھ سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ میں کسی مسئلے کے سمجھنے اور بیان کرنے میں غلطی پر ہوں۔ ایسے مواقع پر میں امید کرتا ہوں کہ میری کسی غلطی کو قصد و اختیار پر محمول نہیں کیا جائے گا بلکہ ناواقفیت اور قلت فہم کا نتیجہ سمجھا جائے گا اور اہل علم حضرات میری اصلاح کی کوشش فرمائیں گے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے غلطی پر اصرار کرنے والا ہٹ دھرم نہ پائیں گے۔''

''لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کا ذہن بھی ترقی کرتا ہے اور اس کی فکر بھی ارتقا کے منازل سے گزرتی ہے۔ میرے خیالات کو میرے ذہنی ارتقا کے پس منظر سے کاٹ کر کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں میں نے چند آرا قائم کی تھیں۔ تحقیق و جستجو کے بعد کچھ میں میں نے ترمیم بھی کی ہے۔ ایک زندہ اور سوچنے والا دماغ ایسا ہی کرے گا بھی۔ میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ ایک رائے ظاہر کرنے کے بعد میں سوچنا بند کر دیتا ہوں۔''

❖

(بقول سیموبل ٹیلر ''زندہ انسانوں کی آرا بدلتی ہیں۔ صرف انگلستان کے پتھر ہی وہ مخلوق ہیں جو اپنی تردید نہیں کرتے۔''

(رضوی)

خودستائی

خودستائی عیب ہے۔ اسے ہنر کوئی نہیں مانتا۔ لیکن مولانا مودودیؒ کی خودستائی کا یہ انداز دیکھیے:

''خدا کے فضل سے میں نے کوئی بات یا کوئی کام جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور نہیں کیا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے نہ کہ بندوں کو، چناں چہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی لفظ خلافِ حق نہیں کہا۔''

''میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص میں سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن وسنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسولؐ نے کیا کہا ہے۔''

زندہ دِلی

قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ کی گرفتاری (۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۸) کے موقعے پر جب پولیس والے مولانا کو گرفتار کرنے کے لیے مولانا کی قیام گاہ پر آئے اور انھیں گرفتاری کا وارنٹ دکھایا کہ انھیں غیر معینہ مدت کے لیے گرفتار کیا جا رہا ہے تو مولانا زنان خانے میں تشریف لے گئے اور کپڑے تبدیل کر کے ہشاش بشاش باہر آئے۔ برآمدے میں رفقا سے ملے پھر کہا، ''ڈبیہ بٹوا کہاں ہے؟ آخری پان کھا لیا جائے۔'' کسی نے پوچھا ''آخری کیوں؟'' ہنستے ہوئے فرمایا ''بس اب طلاق دے رہا ہوں۔'' پان جیسے رفیقِ قدیم کے بارے میں یہ سن کر نعیم صدیقی صاحب نے پوچھا ''کیا جیل سے چھوٹنے کے بعد بھی طلاق باقی رہے گی۔'' ''نہیں یہ طلاق رجعی ہے، مغلظہ نہیں۔'' سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدت کی قید کے لیے روانہ ہو گیا۔

❖

جماعتِ اسلامی ــــــ اغراض ومقاصد

اگست ۱۹۴۱ میں جب جماعت اسلامی کی بنیاد پڑی اور مولانا مودودیؒ بالاتفاق اس کے پہلے امیر منتخب ہوئے تو انھوں نے جماعت اسلامی کے اغراض ومقاصد کے بارے میں فرمایا:

''ہماری یہ جماعت جس غرض کے لیے اُٹھی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں اور آغاز کار کے طور پر اس ملک (غیر منقسم ہندوستان) میں ایک ایسی سوسائٹی منظم کی جائے جو اسلام کے اصلی اصولوں پر شعور و اخلاص کے ساتھ خود عامل ہو، دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اس کی صحیح نمائندگی کرے اور بالآخر جہاں جہاں بھی اس کی طاقت بڑھتی جائے وہاں کے افکار و اخلاق، تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے نظام کو موجودہ دہریت و مادہ پرستی کی بنیادوں سے ہٹا کر سچی خدا پرستی یعنی توحید کی بنیاد پر قائم کردے۔ اس جماعت کو یہ یقین ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کا پورا نظام زندگی جن اصولوں پر قائم ہے وہ قطعاً فاسد اصول ہیں۔ اگر دنیا کا نظام انھی اصولوں پر چلتا رہا تو یہ دنیا بڑے ہولناک نتائج سے دوچار ہوگی۔''

صحیح نوعیت

''خوب سمجھ لیجیے کہ ہماری حیثیت بعینہٖ اس جماعت کی سی نہیں ہے جو ابتداءً نبی کی قیادت میں بنتی ہے بلکہ ہماری حیثیت اس جماعت کی ہے جو اصل نظام جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کو تازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نبی کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی ہے اور اس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہوتا ہے۔ مگر بعد میں اس نظام اور اس کام کو تازہ کرنے کے لیے جو لوگ اُٹھیں ضروری نہیں کہ ان سب کی بھی ایک ہی جماعت ہو۔ ایسی جماعتیں بہ یک وقت بہت سی ہو سکتی ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں اور ہمارا امیر ہی امیر المومنین ہے۔ اس معاملے میں تمام ان لوگوں کو جو جماعت میں شامل ہوں غلو سے پرہیز کرنا چاہیے کیوں کہ بہر حال ہم کو مسلمانوں میں ایک فرقہ نہیں بننا ہے۔ خدا ہمیں اس سے بچائے کہ ہم اس کے دین کے لیے کچھ کام کرنے کی بجائے مزید خرابیاں پیدا کرنے کا موجب بن جائیں۔''

❖

اب دیکھیے کہ علامہ اقبالؒ کی تمناؤں کا یہ 'دانائے راز' اپنے خطوط کے آئینے میں کیسا نظر آتا ہے۔

باسمہٖ سبحانہ

(نمبر۱)

اچھرہ، لاہور

۱۹۵۲/۶/۱۹

مکرمی ومحترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مولانا کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک کو چھوڑ کر باقی جتنے بھی بینک ہیں ان کے ہر شعبہ کی ملازمت ناجائز ہے۔ البتہ اسٹیٹ بینک کے صرف ان شعبوں کی ملازمت ناجائز ہے، جن میں بہ راہِ راست سودی لین دین ہوتا ہو۔

خاکسار

غلام علی

معاونِ امیر جماعت اسلامی، پاکستان

اس خط کی تقریب کے سلسلے میں 'عرض حال' میں بیان کر چکا ہوں کہ مولانا مودودیؒ کے نام یہ میرا پہلا خط تھا جو میں نے موصوف مرحوم کو ڈھاکہ سے لکھا تھا۔ اس کا یہ جواب غلام علی صاحب، معاون امیر جماعت اسلامی پاکستان نے دیا۔ اس خط میں چوں کہ میرے استفسار کے جواب میں مولانا مودودیؒ ہی کی رائے تحریر ہے اور ایک اہم شرعی مسئلے پر مولانا مودودیؒ کی رائے اس خط سے معلوم ہوتی ہے اس لیے اسے شامل اشاعت کر رہا ہوں۔

یہ ان دو خطوں میں سے ایک ہے، جن کی اصل میرے پاس محفوظ نہیں رہی اس کی وجہ میں 'عرض حال' میں بیان کر چکا ہوں۔

رضوی

باسمہٖ سبحانہ

(نمبر۲)

اچھرہ۔ لاہور

۳۰ر نومبر ۱۹۶۱

محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کے مخلصانہ مشوروں اور تنبیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ایک انسان ہوں اور انسان ہر وقت معیاری کام کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس کو دوستوں اور خیر خواہوں کی مدد درکار ہوتی ہے کہ جب وہ معیار سے گرے تو وہ اسے متنبہ کردیا کریں۔ آئندہ بھی مجھ کو مخلصانہ مشوروں سے محروم نہ رکھیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

اللہ اکبر! ملاحظہ فرمایئے۔ اس خط کے ایک ایک لفظ سے کس درجہ للّٰہیت ٹپک رہی ہے۔ مجسم انکسار اور سراپا خلوص کے علاوہ اپنی اس تحریر میں لکھنے والا اور کیا نظر آتا ہے؟ کون یقین کرے گا کہ وہ شخص جو اپنے وقت ہی کے نہیں بلکہ پوری تاریخ کے علما و مفکرین اسلام کی صف اول میں اپنا مقام رکھتا ہو ایک اجنبی اور قطعی غیر معروف شخص کی ایک ''گستاخی'' کے جواب میں اتنے عجز و انکسار سے کام لے گا، اعتراف قصور کرے گا اور آئندہ 'مخلصانہ مشوروں سے محروم نہ رکھنے' کی درخواست کرے گا۔ غرور علم، کبر مرتبت اور کسی بھی درجے میں انانیت کا شائبہ بھی کیا اس میں پایا جاتا ہے؟ ہمارے زمانہ کے علمائے کرام میں ایسے کتنے ہوں گے جو اس بے نفسی کا مظاہرہ کرنے پر قادر ہوں اور اپنے نام کسی ایسے خط کو جیسا کہ میں نے مولانا کو لکھا تھا محض ردی کی ٹوکری کے قابل نہ سمجھیں۔

میرے جس خط کا یہ جواب ہے اس کی تقریب بھی عرض کردوں۔ 'ترجمان القرآن' کے خصوصی شمارے 'منصب رسالت نمبر' کا جب میں نے مطالعہ کیا (اس میں مولانا مودودیؒ سے ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی، جو غلام احمد پرویز کے منکرین حجیت حدیث کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے، حجیت حدیث کے بارے میں مراسلت بھی شامل ہے اور مولانا مودودیؒ نے اپنے موقف کی

تائید میں نہایت وقیع اور عالمانہ دلائل دیے ہیں) میں نے اس میں دیکھا کہ ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے اپنے بعد کے خطوط میں کچھ اوچھا انداز بیان اختیار کرلیا تھا اور مولانا مودودیؒ کی شخصیت پر طنز کیے تھے۔ قدرتی طور پر مجھے اس سے تکلیف ہوئی لیکن ساتھ ہی میرا یہ بھی تاثر تھا کہ ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے اپنے خیالات جو بھی ہوں اور اس مراسلت کا آغاز کرنے سے ان کی نیت خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن انھوں نے مراسلت بہ ہر حال ایک علمی مسئلے میں سائل کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اور مولانا مودودیؒ مجیب تھے تو مولانا مودودیؒ کو تفہیمانہ انداز ہی برقرار رکھنا چاہیے تھا جب کہ اپنے جوابی خطوط میں کہیں کہیں مولانا مودودیؒ اس انداز سے قدرے ہٹے ہوئے نظر آئے۔ یہی بات میں نے قلم برداشتہ مولانا مودودیؒ کو لکھ دی جس کا یہ جواب مولانا نے دیا۔

مولانا کے اس خط کے ساتھ ایک بہت دلچسپ واقعے کی یاد بھی وابستہ ہے جو عرض کرتا ہوں۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں جماعت اسلامی کے اجتماع کے بعد لاہور میں چند دن گزار کر ۳۱/ اکتوبر کو میں کراچی کے لیے روانہ ہو گیا جہاں میرے متعدد عزیز اور احباب تھے۔ کراچی میں ایک دن اپنے علیگی احباب کی محفل میں مذہب اور سیاست کے موضوع پر بات چل پڑی تو میں نے کہا کہ سیاسی اقتدار اسلام کو ایجاباً مقصود و مطلوب ہے... بات بڑھی تو میرے ایک دوست نے معلوم کیا کہ کیا میں اس بات کو تفصیل کے ساتھ کسی رسمی محفل میں کہنے کے لیے آمادہ ہوں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ طے ہوا کہ ہر اتوار کو ایک صاحب کے مکان پر (ان صاحب کا نام مجھے یاد نہیں رہا البتہ اتنا یاد ہے کہ ان صاحب کے نام کے ساتھ 'جار چوی' جڑا ہوا تھا) سہ پہر میں ایک نشست ہوتی ہے، جس میں کچھ تعلیم یافتہ اصحاب شریک ہوتے ہیں۔ اس نشست میں مَیں اس موضوع پر اظہار خیال کروں۔ اتوار کے بعض اخبارات میں اس کی اطلاع بھی شائع کردی گئی۔ اس نشست میں کوئی ۳۵-۴۰ اصحاب موجود تھے۔ میں نے آیت تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور اضعف الایمان والی حدیث کے حوالہ سے کوئی نصف گھنٹہ اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد ۳، ۴ سوالات مجھ سے کیے گئے اور محفل برخاست ہوگئی۔ صرف ۵، ۶ افراد کو صاحب خانہ نے چائے کے لیے روک لیا۔ ان میں دو میرے علیگی دوست بھی تھے۔ دوسرے اصحاب میں ایک نوعمر صاحب پاکستانی بحریہ (Navy) میں کوئی جونیر آفیسر تھے۔ بے تکلفی سے گفتگو ہو رہی تھی اور میرے علیگی دوست مولانا مودودیؒ سے میری نیازمندی وعقیدت کے حوالہ

سے میری کھنچائی بھی کررہے تھے کہ نیوی کے ان افسر صاحب نے مولانا مودودیؒ کے بارے میں کہا کہ وہ بہت خود پسند اور ضدی شخص ہیں جو بات ایک دفعہ وہ کہہ دیں پھر اس کے خلاف کوئی لاکھ دلائل دے وہ مان کرنہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ دوسرے معاملات کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن علمی امور میں مولانا مودودیؒ کا واضح موقف یہ ہے کہ اگر دلیل کی قوت سے ان کی کسی رائے کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو اپنی رائے سے رجوع کر لینے میں انھیں کوئی تامل نہیں ہوگا۔ اس پر ان صاحب نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ بات مولانا سے عقیدت کی بنا پر کہہ رہا ہوں جب کہ ان کی دانست میں مولانا غرور علم و مرتبہ کا شکار ہیں۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ مولانا نے اپنی قابل قدر کتاب 'حقوق الزوجین' میں اپنی ایک غلطی سے ایک گمنام شخص کی نشان دہی پر رجوع کر لیا تھا اور اس کا برملا اظہار کر کے کتاب کے پڑھنے والوں سے اُن صاحب کے حق میں دعائے خیر کی درخواست بھی کی تھی۔ یہ بات میں نے نیوی کے ان افسر صاحب کو بتائی اور پھر معاً مجھے مولانا کا میرے نام لکھا ہوا خط یاد آ گیا اور میں نے ان سے کہا کہ دیکھیے میں ایک بالکل غیر معروف شخص ہوں، ہندوستانی ہوں اور مولانا سے میری پہلی ملاقات ابھی کچھ دن پہلے لاہور میں ہوئی ہے لیکن اب سے دو تین سال پہلے میری ایک تنقید کو مولانا مودودیؒ نے نہ صرف یہ کہ انگیز کیا بلکہ اس کا نہایت منکسرانہ جواب دیا اور پھر میں نے حافظہ کی مدد سے مولانا کے اس خط کا خلاصہ انھیں سنایا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ اگر وہ خط میں انھیں دکھادوں تو نہ صرف وہ مولانا کے بارے میں اپنی رائے سے رجوع کر لیں گے بلکہ مولانا کی رفعت و عظمت کے معترف بھی ہو جائیں گے۔ میں نے کہا میں ہندوستان واپس جا کر یہ خط ان کے دیکھنے کے لیے بھیج دوں گا۔ چناں چہ جنوری ۱۹۶۴ میں ہندوستان واپس آ کر مولانا کا یہ خط اپنے علیگ دوست کو بھیج دیا جو اس محفل میں موجود تھے کہ یہ خط ان کو دکھا کر مجھے واپس کریں۔ چناں چہ میرے دوست نے یہ خط ان کو دکھا کر مجھے واپس کر دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان صاحب کا کیا ردعمل تھا۔ اس لیے کہ اس کے بعد کئی برس تک میرا کراچی جانا نہیں ہوا اور ایک طویل عرصے کے بعد جب میں دوبارہ کراچی گیا اور اپنے دوست سے ان صاحب کے بارے میں معلوم کیا تو میرے دوست نے بتایا کہ ان صاحب سے پھر ان کا کوئی ربط نہیں رہا اور انھیں نہیں معلوم کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اچھرہ۔لاہور (نمبر۳)

(پاکستان)

۲۵/جولائی ۱۹۶۲

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا دوسرا عنایت نامہ بھی موصول ہوا۔اس سے قبل آپ کے سوال کا جواب دیا جاچکا تھا۔امید ہے کہ اب تک پہنچ چکا ہوگا۔ 'حتّٰی' کا ترجمہ ''تاوقتیکہ'' اگر میں کردیتا تو پڑھنے والا اس غلط فہمی میں پڑ سکتا تھا کہ جب نشہ اس حد تک ہلکا ہو جائے کہ نماز کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہو تو نماز پڑھی جاسکتی ہے۔اس لیے میں نے 'حتّٰی' کا ایک فقرہ میں کیا ہے تاکہ اس کا اصل مدعا سمجھ لیا جائے۔

آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ میرے اس ترجمے سے وہ رجحان پیدا ہوتا ہے، جس کی تردید میں نے حاشیہ میں کی ہے۔وہ رجحان تو میرے اس ترجمہ سے پہلے لوگوں میں موجود تھا اور میں نے بارہا لوگوں کو اس آیت سے یہ استدلال کرتے سنا تھا کہ جو شخص عربی عبارت کا مطلب نہ سمجھ سکے اس کی نماز بے کار ہے۔

کتابت کی غلطی کی نشان دہی کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔اس کو نوٹ کرلیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مجھے یاد نہیں کہ اس سے قبل کے میرے جس سوال کا جواب دینے کا مولانا نے اپنے اس خط میں تذکرہ کیا ہے وہ کیا سوال تھا جو میں نے کیا تھا اور نہ مولانا کا وہ خط ہی اب میرے پاس ہے۔

میرے جس خط کا یہ جواب ہے وہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۲۵ کے مولانا کے کیے ہوئے

ترجمے کے بارے میں تھا۔ مولانا نے تفہیم القرآن میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ''اے ایمان والو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو...'' مجھے یہ خیال ہوا کہ اس ترجمہ سے مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا خصوصاً اس وجہ سے کہ اس عبارت میں مولانا نے عربی لفظ 'حَتّٰی' کا ترجمہ کرنے سے احتراز کیا ہے جب کہ شاہ رفیع الدینؒ صاحب اور مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم نے اس لفظ کے ترجمہ (تا اینکہ) کا التزام کیا ہے۔ میں نے عرض کی تھی کہ میری دانست میں اس آیت کا ترجمہ یوں مناسب ہوتا۔ ''اے ایمان والو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ تا ایں کہ تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔'' اور میں نے یہی ترجمہ اپنی تفہیم کی جلد میں نوٹ کر رکھا ہے۔ میرے اس خط کا یہ جواب مولانا نے عنایت فرمایا۔

کتابت کی جس غلطی کی میں نے نشان دہی کی تھی وہ تفہیم القرآن کی جلد اول کے صفحہ ۵۷۹ پر عربی متن کی آخری سطر کے پہلے لفظ ضَیِّقاً کے بارے میں تھی۔ اس لفظ کی کتابت میں ی کے نیچے زیر کی علامت املا ہونے سے رہ گئی تھی، جن حضرات کے پاس تفہیم کا پہلا ایڈیشن ہے وہ اس میں اس غلطی کو دیکھ سکتے ہیں، بعد کے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر دی گئی۔

اس سلسلے میں ایک بات اور مجھے یہ یاد ہے کہ میں نے کتابت کی اس غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تاج کمپنی، لاہور کی طرف سے ان کے مطبوعہ قرآن شریف کے نسخوں پر یہ اعلان ہوتا ہے کہ جو صاحب اس نسخہ میں کتابت کی کسی غلطی کی نشان دہی کریں گے۔ انھیں تاج کمپنی کی طرف سے ہر ایک غلطی کی نشان دہی پر ایک اشرفی بہ طور شکرانہ پیش کی جائے گی۔ اس غلطی کی نشان دہی کے عوض آپ میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔ اس طرح میرے لیے مولانا مودودیؒ کی جزائے خیر کی دعا ایک طرح سے فرمائشی بھی ہے۔

رضوی

باسمہٖ سبحانہ

اچھرہ۔لاہور (نمبر۴) 3307/19.10.64

۱۲رجمادی الثانی ۱۳۸۴ھ

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے پیغام مبارکباد اور اظہارِ مسرت کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔اللہ کا شکر ہے اس نے نو ماہ کے دور معطل وابتلا کے بعد باعزت طریق پر جماعت اسلامی کو بہ حال کر دیا اور مجھے اور میرے رفقا کو حبس بے جا سے رہائی بخشی۔ہم سب اللہ ہی کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو ہم نے اسی کے حوالہ کر دیا ہے۔دعا فرمائیں کہ وہ ہمیں آئندہ بھی صبر وثبات عطا فرمائے اور خدمت خلق کی توفیق دے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

اکتوبر ۱۹۶۳ میں جماعت اسلامی کے کل پاکستان اجتماع لاہور کے کوئی دو ماہ بعد ماہ جنوری ۱۹۶۴ کے پہلے ہفتہ میں حکومتِ پاکستان نے جماعت اسلامی، پاکستان کو غیر قانونی قرار دے کر مولانا مودودیؒ اور چند دوسرے ارکان کو احتیاطی نظر بندی کے قانون کے تحت گرفتار کر کے داخل زنداں کر دیا تھا۔پھر اندرونی و بیرونی دباؤ سے مجبور ہو کر اوائل اکتوبر ۱۹۶۴ میں جماعت پر سے پابندی اٹھا کر مولانا مودودیؒ اور دیگر ارکانِ جماعت کو رِہا کر دیا۔ میں اگست ۱۹۶۴ میں لندن چلا گیا تھا۔وہاں سے مولانا کو میں نے مبارکباد کا خط لکھا، جس کا یہ جواب مولانا نے دیا۔

رضوی

باسمہٖ سبحانہ

۱۱ر شعبان۱۳۸۴ھ (نمبر۵)

3475/16.12.64

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط آئے بہت دن ہوگئے مگر مجھے آج کل اتنی سخت مصروفیت ہے کہ خطوط پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے، کجا کہ مسائل پر مفصل مراسلت کرسکوں آپ کو ڈاک کے ذریعے میں اپنی ایک تقریر بھیج رہا ہوں اسے پڑھ کر آپ کو میرا نقطہ نظر اچھی طرح معلوم ہوجائے گا۔

میں ان نقصانات سے واقف ہوں جو صدر ایوب صاحب کی آمریت سے اب تک پاکستان کے لوگوں کو دینی، اخلاقی اور مادی حیثیت سے پہنچے ہیں اور مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ اگر یہ آمریت آئندہ کے لیے مستحکم ہوگئی تو مزید کیا نقصانات پہنچیں گے۔ایسی حالت میں میرے لیے خدا کے حضور یہ ذمہ داری لینا ممکن نہیں ہے کہ میرے کسی فعل کی وجہ سے یہ آمریت ملک پر از سرِ نو مسلط ہو اور مجھے یقین ہے کہ اگر اس انتخاب میں فاطمہ جناح کی تائید نہ کی گئی تو یہ آمریت پھر مسلط ہو جائے گی۔ اس کا مسلط ہونا میرے نزدیک ایک عورت کو سربراہ بنانے کی بہ نسبت دس گنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔

مختصر یہ کہ میں خدا کے ہاں اس امر کی ذمہ داری اٹھانے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا کہ میری کسی غلطی کی وجہ سے ایوب خاں صاحب کی آمریت پھر سے اس ملک پر مسلط ہوجائے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

جن دنوں صدر ایوب خاں مرحوم اور محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ کے درمیان صدارتی انتخاب کا مقابلہ ہوا میں ان دنوں لندن میں تھا۔ وہاں میں نے اخبارات میں پڑھا کہ جماعت اسلامی نے اس مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔اس پر مجھے شرعی نقطۂ نظر

سے تعجب ہوا اور میں نے اس بارے میں مولانا کو لندن سے ہی ایک خط لکھا تھا، جس کا یہ جواب مولانا موصوف نے دیا (کچھ دنوں بعد مولانا عامر عثمانی صاحبؒ نے اپنے ماہ نامہ 'تجلی' میں اپنے مخصوص انداز میں اس موضوع پر بڑی عمدہ بحث کی تھی) اس خط سے میں نے ایک فائدہ بھی اُٹھایا۔ ۱۹۸۹ء کے انتخابات کے نتیجہ میں پاکستان میں مرکزی حکومت پر پاکستان پیپلز پارٹی کا قبضہ ہوا اور بے نظیر بھٹو صاحبہ وزیر اعظم ہوئیں تو وہاں کے دینی حلقوں میں جن میں جماعت اسلامی بھی شامل تھی عورت کے سربراہ حکومت ہونے پر شریعت کے زاویہ سے تنقید کی گئی۔ ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور اخبارات و جرائد میں اس بارے میں مضامین شائع ہوئے۔ اس زمانے میں میرے جاننے والوں میں سے اکثر نے مجھ سے کہا بھی کہ سابق میں مولانا مودودیؒ، فاطمہ جناح صاحبہؒ کی اس منصب کے لیے حمایت کر چکے ہیں پھر اب پاکستان کی جماعت اسلامی بے نظیر صاحبہ کے سربراہ ہو جانے پر کیوں معترض ہے۔ ان لوگوں کو تو میں نے مولانا مودودیؒ کے اس خط کی روشنی میں مطمئن کر دیا لیکن یہ خیال مجھے برابر ستاتا رہا کہ اور بھی ہزاروں لوگوں کے دل میں کھٹک ہوگی ان کے ذہنوں کو کس طرح اس بارے میں صاف کیا جائے کہ مولانا مودودیؒ نے عورت کی سربراہی کو شرعی موقف سے ہٹ کر روا نہیں رکھا تھا بلکہ اس کو شریعت کے خلاف اور گناہ تسلیم کرتے ہوئے اہون البلیّتین کے پیش نظر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔ اتفاق سے مجھے اس کا ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہوا یوں کہ پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت روز نامہ 'جنگ' کے مالک اور مدیرِ اعلیٰ خلیل الرحمٰن صاحب ان ہی دنوں ہندوستان آئے تو دہلی کے ہفت روزہ 'اخبارنو' نے ان سے ایک انٹرویو لیا جو اس جریدہ کی ۱۹-۲۵ر مئی ۱۹۸۹ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس انٹرویو میں بے نظیر بھٹو صاحبہ کی سربراہی کے مسئلہ پر ایڈیٹر 'جنگ' کی رائے معلوم کی گئی تو انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''ایک زمانے میں مولانا مودودیؒ عورت کو اسلامی مملکت کی سربراہی کا اہل قرار دے چکے ہیں۔ اگر عورت اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں ہو سکتی تو پھر مولانا مودودیؒ کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' میں اپنی بات کو عوام تک پہنچانے کے لیے جس بہانے کی تلاش میں تھا وہ مجھے ایڈیٹر 'جنگ' کے اس جواب سے ہاتھ آ گیا اور میں نے فوراً ہی ایک مختصر سا مضمون لکھا جو 'اخبارنو' کی ۲-۷ر جون ۱۹۸۹ کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس مضمون میں مولانا مودودیؒ کا یہ خط بھی میں نے نقل کر دیا اور لکھا کہ ایوب خاں مرحوم کے دوبارہ صدر منتخب ہو جانے کو جتنی بڑی برائی مولانا مودودیؒ سمجھتے تھے اس سے تو کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن مولانا کے اس خط سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کو شرعاً ناقابل قبول ہی سمجھتے تھے اور مولانا مرحوم کے اس موقف سے واقف ہوتے ہوئے بھی، جس کا برملا اظہار پاکستان کے اخبارات ورسائل میں اور عوامی جلسوں کے پلیٹ فارم سے اسی زمانہ میں کیا جا چکا تھا 'جنگ' کے ایڈیٹر صاحب نے دانستہ اپنے جواب سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مرحوم نے شریعت کے علی الرغم مطلق طور پر عورت کی سربراہی کی حمایت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس طرح میں اس خط کی بنیاد پر اس بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک خاصے طبقے کے ذہن کو اس مسئلہ میں مولانا مودودیؒ کے تعلق سے صاف کرنے میں کامیاب ہوا۔

رضوی

باسمہٖ سبحانہ

اچھرہ۔لاہور (نمبر۶)

۲؍اگست ۱۹۶۷

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا طویل عنایت نامہ ملا۔آپ نے میرے ساتھ اپنے پچھلے رابطوں کی جو تاریخ بیان کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو آپ سے مراسلت کرنا اچھا خاصا خوفناک کام معلوم ہوتا ہے۔تاہم ہرچہ باداباد آپ کو یہ مختصر جواب دے رہا ہوں۔

تفہیم القرآن کے سلسلہ میں آپ نے جو امور نوٹ کیے ہیں ان کو میں نے محفوظ کر رکھا ہے اور ان شاءاللہ ان پر غور کر کے جہاں اصلاح کی ضرورت محسوس کروں گا وہاں اصلاح کردوں گا۔اس تکلیف فرمائی کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔

حروف مقطعات کی جو توجیہ میں نے کی ہے اس کی دو مثالیں مشہور امام اللغت ابو اسحاق الزجاج نے دی ہیں۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

مولانا مودودیؒ کا یہ خط ان دو خطوں میں سے ایک ہے جن کی اصل محفوظ نہ رہ سکی صرف نقل رہ گئی، جس کی وضاحت میں نے 'عرض حال' میں کردی ہے۔ یہ نقل بھی نامکمل ہے، جس کے بارے میں آگے عرض کروں گا۔

میرے جس طویل خط کا اس میں تذکرہ ہے مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس میں کیا لکھا تھا البتہ مجھ سے پچھلے رابطوں کی تاریخ کی خوفناکی کے بارے میں جو مولانا نے لکھا ہے اس کا پس منظر مجھے یاد ہے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مولانا مودودیؒ سے میری مراسلت اور ملاقات دونوں ہی مولانا اور جماعت پر کسی نہ کسی افتاد کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں میں نے ۱۸؍دسمبر ۱۹۵۲ء کو

جو ذرا طویل خط مولانا کو لکھا تھا وہ پیشہ وکالت کے بارے میں ایک استفسار تھا۔ جس کا تذکرہ میں نے 'عرض حال' میں کیا ہے اور جس کا جواب میرے پاس محفوظ نہیں رہا۔ اس کے چند ہی دنوں بعد (اس وقت کے مغربی) پاکستان میں قادیانیوں کا مسلہ اٹھ کھڑا ہوا، ہنگامے ہوئے، مارشل لا لگا اور رسالہ مسئلہ قادیانیت، لکھنے کے جرم میں مولانا کو گرفتار کر کے مارشل لا کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور مولانا کو سزائے موت سنائی گئی۔ پھر اکتوبر ۱۹۶۳ میں لاہور میں مولانا سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو اس کے ایک ہفتہ کے اندر ہی جماعت اسلامی کے کل پاکستان اجتماع میں چند غنڈوں نے غنڈہ گردی کی اور مولانا مودودیؒ پر ایک غنڈہ نے پستول سے فائر کیا (تفصیلات میں 'عرض حال' میں بیان کر چکا ہوں) اس کے کوئی مہینہ بھر بعد مولانا سے میری ایک مختصر ملاقات کراچی میں ہوئی جب وہ پاکستان کے باہر کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ اس ملاقات کے کوئی ایک ماہ بعد ۶ ر جنوری ۱۹۶۴ کو میں بحری جہاز سے کراچی سے بمبئی کے لیے روانہ ہوا اور اسی دن جماعت پر پابندی لگی اور مولانا کو بعض دیگر ارکانِ جماعت کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ مولانا کی گرفتاری کا وقت وہی تھا جب ہمارے جہاز نے کراچی کی بندرگاہ چھوڑی۔ اپنے خط میں ان اتفاقات کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے مولانا کو یہ بھی لکھا تھا کہ دیکھیے جب تک میں پاکستان میں رہا ایوب خاں صاحب کی ہمت نہیں ہوئی کہ آپ پر ہاتھ ڈال سکیں۔ بس ادھر میں نے کراچی چھوڑا اُدھر انھوں نے آپ پر اور جماعت پر ہاتھ مار دیا۔ (بعد کو اگست ۱۹۶۵ میں لندن سے واپس ہوتے ہوئے جب میں مولانا سے لاہور میں ملا تو مولانا کو میرے خط کا یہ فقرہ یاد تھا اور لطف لے کر انھوں نے میرے خط کے اس فقرہ کا تذکرہ کیا) ان سانحات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اپنے خط میں اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کہیں میرے اس خط کے بعد پھر مولانا پر کوئی افتاد نہ پڑ جائے۔ مولانا نے اسی کے جواب میں لکھا کہ مجھ سے مراسلت کرنا اچھا خاصا خوفناک کام معلوم ہوتا ہے۔

تفہیم القرآن کے بارے میں وہ کون سی باتیں تھیں، جن کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی اور جن کے بارے میں مولانا نے لکھا تھا کہ انھوں نے آئندہ غور کے لیے محفوظ کر لیا ہے، مجھے بالکل یاد نہیں۔ بس ایک بات اس جواب سے یاد آتی ہے جو عرض کرتا ہوں۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں مولانا نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ ''جس زمانے

میں قرآن مجید نازل ہوا اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب و شعرا دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چناں چہ اب بھی ایام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔'' اس کے حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ اس اگر اس دور کے کلام عرب سے چند مثالیں اپنے بیان کی تائید میں نقل کر دی گئی ہوتیں تو بات مکمل ہو جاتی اور تجویز پیش کی تھی کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ایسی مثالوں کا اضافہ کر دیں اور ساتھ ہی یہ گزارش بھی کی تھی کہ فی الحال میرے استفادہ کے لیے ایسی کوئی مثال تحریر فرما دیں۔ میری گزارش کی پذیرائی میں مولانا نے ابو اسحاق الزجاج کی دی ہوئی مثالوں سے دو اشعار نقل کیے تھے۔ یہ دونوں اشعار حروفِ مقطعات پر ختم ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ جن صاحب نے مولانا کے خطوں کی نقل میرے لیے تیار کی انھوں نے اس خط میں سے وہ اشعار نقل نہیں کیے۔ اس لیے وہ اشعار مولانا کے اس خط کے ساتھ شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ (اس سلسلہ میں مزید ملاحظہ ہو خط نمبر ۱۹)۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر ۷) فون نمبر: ۲۵۰۷

۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ حوالہ: ۴۵۹

لاہور۔۱۲ (پاکستان) مورخہ: 6.3.68

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملنے سے پہلے ہی ریڈینس میں میری نگاہ سے تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے کی دو اقساط گزر چکی تھیں۔ ترجمے کے سلسلہ میں جو اعتراضات آپ کے مکتوب نگار نے کیے ہیں اس نوعیت کے بعض اعتراضات دوسری جگہوں سے بھی آئے۔ ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کے انگریزی لکھنے والے نہیں ملتے۔ مجبوراً اسی ترجمے کو شائع کر دیا گیا کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اب ہم اس مسئلے پر از سر نو غور کر رہے ہیں اور بہتر ترجمے کا انتظام ہو سکا تو ان شاء اللہ اسے اختیار کیا جائے گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

میں ۱۹۶۸ میں دہلی کے انگریزی ہفت روزہ ریڈینس (Radiance Viewsweekly) کے ادارتی اسٹاف میں شامل ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں مولانا کی تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے (The Meaning of the Quran) کا پہلا حصہ شائع ہوا تھا۔ ہم نے اس کی تلخیص ریڈینس میں شائع کرنی شروع کی۔ تلخیص کا کام میں کرتا تھا۔ اس کی چند قسطوں کے شائع ہونے کے بعد ریڈینس کے ایک ذی علم قاری نے بمبئی سے خط لکھا، جس میں انگریزی ترجمے پر کچھ اعتراضات رقم کرتے ہوئے لکھا کہ مولانا کی اس عظیم الشان تفسیر کے انگریزی ترجمے کا کام تو ماہرین کی ایک کمیٹی کے ذریعے ہونا چاہیے۔ میں نے اس خط کی ایک نقل اپنے خط کے ساتھ مولانا مودودیؒ کو روانہ کر دی۔ میرے اُسی خط کا یہ جواب ہے۔ رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر ۸) فون نمبر: ۲۵۰۷
۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ حوالہ: ۴۲۶
لاہور-۱۲ (پاکستان) مورخہ: ۱۹۶۸/۵/۱

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ شیخ صاحب کا خط چودھری محمد اکبر صاحب کے نام میں نے دیکھ لیا ہے۔ انگریزی ترجمہ کا مسئلہ درحقیقت ہمارے لیے اچھا خاصا دردسر بنا رہا ہے کیوں کہ انگریزی داں پبلک کے سامنے اس کتاب کو موثر اور مفید شکل میں لانا آسان کام نہیں ہے فی الحال پہلا حصہ اس لیے شائع کیا گیا ہے کہ مختلف حلقوں کی طرف سے جو آراء آئیں ان پر غور کر کے اسے زیادہ بہتر بنایا جا سکے۔ مختلف مقامات سے آراء آ رہی ہیں۔ آپ کی یہ تجویز بھی کہ حواشی کو انگریزی میں مختصر کر دیا جائے زیر غور ہے، مگر اس معاملے میں یہ امر فیصلہ طلب رہے گا کہ حواشی کے کس حصے کو رکھا جائے اور کس کو ساقط کیا جائے۔ تمام انگریزی خواں پبلک کی ضروریات بھی یکساں نہیں ہے۔

تفہیم القرآن کے متعلق آپ نے جو امور نوٹ کر کے بھیجے تھے وہ میں نے نظر ثانی کے وقت فائدہ اُٹھانے کے لیے محفوظ رکھ چھوڑے ہیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا کا یہ خط ان کے گزشتہ خط مورخہ ۶ / مارچ ۱۹۶۸ (خط نمبر ۷) کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے اس میں 'شیخ صاحب' سے مراد بمبئی کے وہ صاحب ہیں، جنھوں نے تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا (ان کا پورا نام اب میرے حافظے میں نہیں

ہے) اور چودھری محمد اکبر صاحب سے مراد تفہیم القرآن کے انگریزی مترجم ہیں، جن سے اپنی ملاقات کا تذکرہ میں ''عرض حال'' میں کر چکا ہوں۔

تفہیم القرآن کے متعلق میں نے کن امور کا نوٹ بھیجا تھا مجھے یاد نہیں۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جماعت اسلامی پاکستان (نمبر۹) حوالہ نمبر ۳۳۰۳

۵-اے ذیلدار پارک۔اچھرہ تاریخ:۲/۱۱/۱۹۷۰

لاہور-۱۲(پاکستان)

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کو یاددہانی کی کیا ضرورت تھی اور میں آپ کو آخر بھول کیسے سکتا تھا؟لیکن یہ توقع نہ تھی کہ آپ کا خط ہانگ کانگ سے وصول ہوگا۔

آپ اطمینان رکھیں کہ سردست تو ہم برسر اقتدار نہیں آرہے ہیں،لیکن اگر کبھی برسرِ اقتدار آگئے تو ریڈیو سے صرف ان پروگراموں کو خارج کریں گے جو دین واخلاق کے منافی ہیں۔کرکٹ کمنٹری اس تعریف میں نہیں آتی۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا کا یہ خط میرے جس خط کے جواب میں ہے اس کی تقریب یہ تھی کہ میں ۷۱-۱۹۷۰ء میں ہانگ کانگ میں تھا۔دسمبر ۱۹۷۰ میں پاکستان میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔یہ وہی انتخابات تھے،جن کے نتائج کے بعد ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے 'ادھر ہم،ادھر تم' کا نعرہ لگا کر پاکستان کو دولخت کر دیا تھا۔رائچور سے میری ہانگ کانگ کو روانگی سے چند ہی دن قبل کچھ لوگ پاکستان سے آئے تھے۔ان سے گفتگو میں معلوم کیا کہ انتخابات میں کس پارٹی کے زیادہ نمائندوں کے منتخب ہونے کا امکان ہے تو ان سب نے بلا تامل یہی جواب دیا تھا کہ جس منظّم اور موثر انداز میں جماعت اسلامی انتخابی مہم چلا رہی ہے اور جس انداز میں اس کی پذیرائی ہو رہی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی ہی کو اکثریت حاصل ہوگی اور جماعت ہی کی حکومت بنے گی۔پھر اس کے بعد جلد ہی جب میں رائچور سے ہانگ کانگ چلا گیا تو وہاں

پاکستان کے اخبارات مطالعے میں آئے۔ ان میں بھی مختلف جماعتوں کی انتخابی مہم کی رپورٹنگ جس انداز میں ہو رہی تھی اور جماعت اسلامی کے جو اشتہارات اخبارات میں آرہے تھے ان کو دیکھ کر بھی یہی تاثر بنتا تھا۔ جماعت اسلامی ہی سب سے زیادہ منظم اور فعال جماعت ہے، جس کو عوام میں مقبولیت بھی سب سے زیادہ حاصل ہوتی جارہی ہے۔

مزید برآں مجھے ایک بہت دلچسپ واقعہ بھی یاد تھا کہ جن دنوں ۶۴، ۱۹۶۵ء میں لندن میں تھا تو میرے کچھ پاکستانی دوست بی بی سی کی پاکستان سروس سے متعلق تھے۔ انھوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک بی۔ بی۔ سی سے پاکستان کا لاسلکی رابطہ منقطع ہوگیا اور ہر طرح کی کوشش کے باوجود رابطہ قائم نہیں ہوسکا اور نہ کسی اور ذریعے سے ہی پاکستان کے بارے میں کوئی اطلاع مل سکی تو پاکستانی سروس سے متعلق حضرات کینٹین میں جاکر بیٹھ گئے اور قیاس آرائیاں کرنے لگے کہ پاکستان میں کیا ہوا ہوگا۔ پھر سب متفقہ طور پر اس خیال کے حامی ہوگئے کہ پاکستان میں سیاسی انقلاب آگیا ہے اور تمام ذرائع ترسیل پر انقلابیوں نے قبضہ کر کے اس نظم کو عارضی طور پر معطل کر دیا ہے۔ پھر اس پر غور ہوا کہ کونسی پارٹی انقلاب لائی ہوگی۔ چناں چہ ان میں سے دو حضرات نے خود مجھے بتایا کہ انھوں نے اپنے گھروں کو ٹیلی فون کر کے اپنی بیویوں سے یہ کہا کہ وہ بازار سے برقعوں کا کپڑا خرید کر برقعے سی رکھیں۔ پاکستان میں جماعت اسلامی انقلاب لے آئی ہے اور اب برقعے پہننے پڑیں گے۔

بہر حال اسی ذہنی کیفیت میں مولانا کو میں نے خط لکھ دیا کہ ان شاء اللہ ان انتخابات کے نتیجے میں جماعت اسلامی کی حکومت بنے گی اور تفریحاً یہ بھی لکھ دیا کہ آپ کی حکومت بن جائے تو اور جو کچھ آپ کریں سو کریں لیکن ریڈیو سے کرکٹ کی کمنٹری پر پابندی نہ لگائیں (میں نے کرکٹ کھیلا کم ہے لیکن کرکٹ کمنٹری بہت شوق سے سنتا تھا اور ان دنوں ہندوستان کی کرکٹ ٹیم غالباً آسٹریلیا گئی ہوئی تھی اور میں ٹیسٹ میچوں کی کمنٹری سنا کرتا تھا)۔

یہ میرے اسی خط کا جواب ہے۔ مولانا کے اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صورتِ حال کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے اور حالات کا کس قدر حقیقت پسندانہ تجزیہ انھوں نے کیا تھا۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(نمبر۱۰)

مرکز جماعتِ اسلامی پاکستان — فون:۵۲۵۰۷
۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ — حوالہ نمبر
لاہور — تاریخ

محترمی ومکرمی — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۴؍دسمبر ملا۔ پاکستان کے انتخابات کے نتائج آپ کو معلوم ہو چکے ہوں گے۔ ان نتائج میں بے ایمانیوں کا کتنا دخل ہے اور عوام کی واقعی رائے کا کتنا، اس کو تو اللہ ہی جانتا ہے۔ بہر حال پاکستان کی قسمت کا جو فیصلہ ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ہمارا کام بہ ہر حال بھلائی کے لیے کوشش کرنا ہے، آگے یہ فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کہ برعظیم ہندو پاکستان میں امت محمدیہ کے ۱۶، ۱۷ کروڑ افراد کا انجام کیا ہو۔

'جنگ' میں میرا جو بیان شائع ہوا ہے وہ دراصل ایک تقریر کا خلاصہ ہے جو میں نے انتخابات سے تقریباً ۲۰ دن پہلے لاہور میں کی تھی۔ اس میں آخری تنبیہ کے طور پر میں نے اسلام کے ان سب نام نہاد حامیوں کو جنھوں نے مل کر جماعت اسلامی کو اپنا اصل ہدف بنالیا تھا خبردار کیا تھا کہ آپ جس حصار کو توڑنے پر اپنا سارا زور صرف کر رہے ہیں یہ اگر ٹوٹ گیا تو الحاد و بے دینی، اشتراکیت اور صوبائی و لسانی تعصبات کے جو طوفان پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے اُٹھ رہے ہیں ان کو روکنا آپ میں سے کسی کے بس کا روگ نہ ہوگا اور آخر میں آپ سب کو پچھتانا ہوگا۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

یہ واحد خط ہے، جس پر نہ نشان حوالہ درج ہے اور نہ تاریخ۔ پتا نہیں یہ فروگزاشت کیسے ہوگئی۔ یہ میرے ہانگ کانگ کے پتے پر آیا تھا۔ اس میں میرے ۴ر دسمبر والے کسی خط کا حوالہ ہے۔ میں اکتوبر ۱۹۷۰ سے مارچ ۱۹۷۱ تک ہانگ کانگ میں تھا اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ یہ خط اواخر دسمبر ۱۹۷۰ کی کسی تاریخ کا لکھا ہوا ہوگا۔ میں نے اپنے ۴ر دسمبر والے خط میں، جس کا مولانا نے حوالہ دیا ہے کیا لکھا تھا مجھے یاد نہیں۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر ۱۱) فون نمبر: ۲۵۰۷
۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ حوالہ: ۳۹۵۶
لاہور-۱۲ (پاکستان) مورخہ: ۱۹۷۰/۱۲/۱۸

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ انتخابات سے کچھ بہت اچھے نتائج کی امید نہ رکھیں۔ بہرحال میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جماعت کے حلقوں میں ان نتائج پر مایوسی یا دل شکستگی کا ذرہ برابر اثر نہیں ہے بلکہ ہم تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس انتخابی مہم میں ہمارے اثرات اتنے بڑے پیمانے پر پھیلے ہیں جتنے پچھلے تیس سال میں نہیں پھیلے تھے۔ ہمیں پورے ملک میں ۲۵ لاکھ ٹھوس ووٹ ملے ہیں جو ہماری دعوت سے اتفاق کرنے والوں نے ہمیں دیے ہیں۔ ان شاء اللہ یہ ہمارا انسانی سرمایہ آگے کام کو بڑھانے کے لیے بہت زیادہ مددگار ہوگا۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

جب پاکستان میں انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو ایک طرف تو مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی کے امیدوار توقع سے بہت کم تعداد میں کامیاب ہوئے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش) میں جماعت اسلامی کا ایک امیدوار بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اس بارے میں مولانا کو ایک خط میں نے ہانگ کانگ سے لکھا۔ جس کا جواب مولانا نے یہ دیا۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جماعت اسلامی پاکستان (نمبر۱۲) فون نمبر: ۵۲۵۰۷

۵-اے ذیلدار پارک۔اچھرہ حوالہ:۹۲۴

لاہور-۱۲(پاکستان) مورخہ: ۱۹۷۱/۳/۲۷

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مولانا محترم آج کل بیمار ہیں۔ چوں کہ ڈاکٹروں نے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے اس لیے ان کے حسب ارشاد میں جواب دے رہا ہوں۔

مسئلہ غلامی پر مولانا محترم کی تحریریں ان کی مختلف کتابوں میں موجود ہیں ان میں سے آپ کو جو کتابیں میسر آسکیں وہاں ملاحظہ کرلیں۔

۱- رسائل ومسائل حصہ اول۔ مضمون ''میدان جنگ میں قحبہ گری''

۲- رسائل ومسائل حصہ دوم۔ مضمون ''اسلام میں غلامی کو ممنوع کیوں نہ کردیا گیا؟''

۳- رسائل ومسائل حصہ سوم۔ مضمون ''کنیز کی تعریف اور اس کے حلال ہونے کی دلیل، تعدد ازدواج اور لونڈیاں۔''

۴- تفہیمات حصہ دوم۔ ''مضمون'' غلامی کا مسئلہ غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق چند سوالات۔''

۵- تفہیم القرآن حصہ اول ودوم۔ انڈکس میں 'غلامی' کے زیرعنوان صفحات کا حوالہ درج ہے۔

۶- ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۵ سورہ محمد آیت نمبر۴

۷- الجہاد فی الاسلام باب 'غلامی'

خاکسار
غلام علی

معاون خصوصی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام میں مسئلہ غلامی کے دو ایک جزئیات پر مجھے انشراح نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے

بارے میں مولانا سے استفسار کیا تھا۔ اس کا یہ جواب ملک غلام علی صاحب نے مولانا مرحوم کی ہدایت پر دیا تھا۔ یہ خط بھی میرے ہانگ کانگ کے دوران قیام آیا تھا۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر۱۳) فون نمبر:۲۵۰۷

۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ حوالہ:۱۱۳۹

لاہور-۱۲ (پاکستان) مورخہ: ۱۹۷۶/۶/۱۱

عزیزم رضوی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا ۷/ جون کا خط ملا۔ صاجزادی کی شادی کی خبر پاکر دلی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہونے والے دونوں زوجین کو ایک دوسرے کا سچا رفیق حیات بنائے، ان کو ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے اور ادا کرنے کی توفیق بخشے اور ان کو سچے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرنے اور اپنی اولاد کو صحیح اسلامی تربیت دینے کی صلاحیت عطا فرمائے۔

ترجمہ قرآن مع مختصر تشریحی حواشی اب طباعت کے آخری مرحلے میں ہے۔ اُمید ہے کہ اس مہینے کے آخر تک طباعت مکمل ہو جائے گی۔ کتاب بھیجنے کا کوئی ذریعہ بہم پہنچ جائے تو اِن شاء اللہ روانہ کروں گا۔ بہتر یہ ہو کہ شادی سے دو ہفتے پہلے مجھے یاد دہانی کرائیں۔

محمد یوسف صدیقی صاحب کے انتقال کا دلی صدمہ ہوا۔ میں نے یہاں ان کے عزیزوں کو تعزیت نامہ بھیج دیا تھا۔ آپ ٹونک کے عزیزوں کو بھی میری طرف سے تعزیت کا پیغام بھیج دیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

میں نے مولانا مودودیؒ سے خواہش کی تھی کہ میری بڑی لڑکی (فرحت جہاں) کی شادی ہونے والی ہے۔ اس موقعے پر دینے کے لیے 'ترجمہ قرآن مجید معہ مختصر حواشی' کا ایک نسخہ کسی ذریعے سے روانہ کردیں۔ اس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ مولانا اسے مرتب فرما رہے ہیں۔ بعد کو مولانا نے اس کا ایک نسخہ روانہ کر دیا (ملاحظہ ہو خط نمبر ۱۴)۔

محمد یوسف صدیقی صاحب سے مراد ٹونک کے یوسف صدیقی صاحب ہیں، جنھیں ان کے ہم وطن احبابِ یوسف میاں کہا کرتے تھے، بڑی خوش شکل اور خوش خصال شخصیت کے مالک تھے۔ تقسیم ملک سے قبل ہی جماعت اسلامی کے رکن ہو گئے تھے اور رکن ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد جماعت کی مرکزی شوریٰ کے رکن ہوئے اور آخر عمر تک رہے۔ انگریزی اخبار نکالنے کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی مہم میں پیش پیش رہے اور جب ۱۹۶۳ میں انگریزی ہفت روزہ ریڈینس (Radiance) جاری ہوا تو اس وقت سے ۲۵ / جون ۱۹۷۵ تک وہ اس کے چیف ایڈیٹر رہے۔ ۲۵، ۲۶ / جون ۱۹۷۵ کی درمیانی شب میں اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ملک میں ایمر جنسی نافذ کردی اور اسی شب مرکز جماعت سے امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب مع رفقا گرفتار کرلیے گئے اور دفتر ریڈینس سے یوسف صدیقی صاحب (مع اسسٹنٹ ایڈیٹر سید اوصاف سعید وصفی صاحب اور عبدالوحید خاں صاحب منیجر ریڈینس جو اس وقت دہلی کی مقامی جماعت کے امیر تھے گرفتار کرلیے گئے) یوسف صدیقی صاحب کو انبالہ جیل لے جایا گیا جہاں چند ماہ بعد تھوڑے وقفہ سے دو دفعہ ان پر زبردست ہارٹ اٹیک ہوا تو یوسف صدیقی صاحب یا ان کے کسی عزیز یا دوست کی درخواست کے بغیر حکومت نے از خود انھیں رہا کر دیا۔ اس کے چند ماہ بعد دوران ایمر جنسی ہی ان کا اپنے وطن ٹونک میں انتقال ہو گیا۔ میں چوں کہ جانتا تھا کہ یوسف صدیقی صاحب سے مولانا مودودیؒ شخصی طور پر واقف ہیں اس لیے میں نے اپنے خط میں ان کے انتقال کی اطلاع مولانا کو دی تھی۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات بھی بیان کردوں۔ یوسف صدیقیؒ صاحب، اسسٹنٹ ایڈیٹر اوصاف سعید صاحب اور منیجر عبدالوحید خاں صاحب کو گرفتار کر کے حکومت نے یہ سمجھا کہ ریڈینس کی اشاعت خود بخود بند ہو جائے گی۔ میں اس زمانہ میں مرکز جماعت اسلامی میں بہ طور مشیر کام کرتا تھا لیکن عارضی طور پر میری رہائش ریڈینس بلڈنگ کی بالائی منزل کے ایک حصہ میں

تھی۔ جب یوسف صدیقی صاحب کو گرفتار کر کے پولیس والے لے جانے لگے تو میں ان کے ساتھ سڑک تک گیا جہاں پولیس کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ راستہ میں یوسف صدیقی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان کی غیر موجودگی میں کسی بھی طرح میں ریڈینس شائع کرتا رہوں۔ چناں چہ میں نے اکاؤنٹینٹ احمد علی صاحب اور ٹائپسٹ صلاح الدین صاحب کے تعاون سے ریڈینس کا ایک شمارہ نکال دیا۔ تب حکومت چونکی اور ۳،۴/ جولائی کی درمیانی شب میں مجھے، احمد علی صاحب اور صلاح الدین صاحب کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور دفتر ریڈینس پر تالے لگا دیے گئے۔ ہم لوگ دہلی کے تہاڑ جیل میں رکھے گئے جہاں امیر جماعت مولانا محمد یوسفؒ اور دیگر ارکان جماعت تھے۔ میں نے وہاں سے اپنی، احمد علی صاحب اور صلاح الدین صاحب کی طرف سے دہلی ہائی کورٹ میں گرفتاری کے خلاف درخواست روانہ کی۔ اس کی سماعت ویاس دیو مسرا صاحب جج نے کی۔ میں نے ہی بحث کی اور جج صاحب نے ہم تینوں کی رہائی کا حکم دیا۔ اس کے ۳،۴ دن بعد ہی پھر مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ میں نے پھر دہلی ہائی کورٹ میں درخواست پیش کی اور پھر ویاس دیو مسرا صاحب نے مجھے بری کر دیا۔ (یہ ویاس دیو مسرا صاحب بڑی فصیح اردو بولتے تھے۔ بعد کو ہماچل پردیش ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے اور وہاں سے انھوں نے مجھے ایک خط اردو ہی میں لکھا تھا) اس کے کوئی تین ماہ بعد ۲۳،۲۴/ مارچ ۱۹۷۶ کی درمیانی شب مجھے پھر گرفتار کرلیا گیا اور مئی کے آخر میں پھر ویاس دیو مسرا صاحب کی عدالت سے میری رہائی کے احکام ہوئے اور حکومت کے خلاف مسرا صاحب نے اپنے فیصلہ میں سخت ریمارکس لکھے۔ ۷/ جون کو میں نے مولانا کو وہ خط لکھا جس کا یہ جواب ہے۔ یہ ریڈینس کے پتے پر آیا تھا اور یقیناً سنسر بھی ہوا ہوگا۔

اپنی اسیری و رہائی کی یہ روداد میں نے اس دلچسپ بات کے پس منظر کے طور پر بیان کی، جس کی بابت میں نے اوپر عرض کیا ہے اور وہ یہ کہ ایمرجنسی کے برخاست ہونے کے بعد جب ریڈینس کے دفاتر کھول دیے گئے اور یوسف صدیقی صاحب کی جگہ میں اس کا ایڈیٹر ہو گیا تو حکومت کے اونچے منصب پر فائز ایک عہدہ دار نے مجھے بتایا کہ اس زمانہ میں حکام متعلقہ کے لیے یہ بات بڑی تعجب انگیز اور دردسری کا باعث بنی رہی تھی کہ یہ شخص تین دفعہ گرفتار کیا جا چکا ہے اور ایمرجنسی نافذ ہے لیکن یہ شخص نہ تو دہلی کے باہر چلا جاتا ہے، نہ دہلی میں کہیں چھپ کر رہتا ہے اور اوپر سے پاکستان سے بلا تکلف ڈاک کے ذریعے سے خط وکتابت بھی کرتا ہے اور وہ بھی مولانا

مودودیؒ جیسے شخص سے، جس سے ہندوستان کی حکومت ناخوش وناراض ہے!! مجھ سے انھوں نے پوچھا بھی کہ میرے اس طرز عمل کا سبب کیا تھا۔ میں کیا جواب دیتا۔ مسکرا کر چپ ہو گیا۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودی (نمبر۱۴) فون نمبر: ۴۱۱۰۱۷

۵-اے ذیلدار پارک۔اچھرہ حوالہ: ۲۱۲۲

لاہور-۱۲ (پاکستان) مورخہ: ۱۹۷۶/۱۲/۳۰

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سید امین الحسن رضوی صاحب (دہلی) کی صاحب زادی کی شادی کے موقعے پر دینے کے لیے قرآن مجید کا ایک نسخہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ بہ راہِ کرم وہاں پہنچا دیں اور رسید سے مطلع فرمائیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا کا یہ خط میرے نام نہیں بلکہ ایک دوسرے صاحب کے نام ہے، جن کے ذریعے سے مولانا مودودیؒ نے میری لڑکی (فرحت جہاں) کی شادی پر اس کے لیے اپنا ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی، بھیجا تھا۔ اس پر میری لڑکی کے لیے ایک دعائیہ جملہ بھی اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔ (یہ نسخہ میری لڑکی کے پاس ایک گراں قدر عطیہ کے طور پر محفوظ ہے) جن صاحب کو یہ خط اور قرآن کا نسخہ دے کر مولانا نے بھیجا تھا وہ خود میرے گھر نہیں آئے بلکہ کسی اور کے ذریعے اسے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ اتفاق سے میں اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ وہ صاحب قرآن مجید کا نسخہ اور یہ خط گھر میں دے کر چلے گئے۔ مجھے آج تک پتا نہ چل سکا کہ وہ کون صاحب تھے، جنھیں مولانا نے یہ خط لکھا تھا۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر۱۵) فون نمبر: ۴۱۱۰۱۷

۵-اے ذیلدار پارک۔اچھرہ حوالہ: ۷۹۸۱

لاہور-۱۲(پاکستان) مورخہ: ۱۹۷۷/۶/۳۰

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ ملا۔ الحمدللہ کہ اب حالات کسی حد تک ٹھیک ہو گئے ہیں لیکن ابتلا کا اندیشہ ابھی باقی ہے۔اللہ کے فضل سے امید ہے کہ یہ بھی دور ہو جائے گا اور وہ منزل قریب تر ہو جائے گی، جس تک پہنچنے کے لیے ہم کئی سال سے کوشاں ہیں۔

ریڈینس برابر مل رہا ہے اس کے از سر نو اجرا پر آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

میرے جس خط کا اس میں حوالہ ہے مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس میں کیا لکھا تھا۔لیکن مولانا کا یہ خط اس وقت کا ہے جب مجھے ریڈینس کا ایڈیٹر ہوئے کوئی دو مہینے ہو چکے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لاہور (نمبر۱٦) حوالہ:۸۱۷

پاکستان مورخہ: ۳/۷/۱۹۷۷

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۲/جون مجھے ۲/جولائی کو ملا۔ کوشش کروں گا کہ جو مضمون آپ کو درکار ہے وہ یہاں سے بروقت بھیج دیا جائے۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

میں ریڈینس کا ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے والا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا کو لکھا تھا کہ پاکستان سے دو تین اصحاب سے مضمون لکھوا کر روانہ کروا دیں تو شکرگزار رہوں گا۔ یہ میرے اس خط کا جواب ہے۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر۱۷) فون نمبر: ۴۱۱۰۱۷

۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ حوالہ:۱۳۸۹

لاہور-۱۲(پاکستان) تاریخ: ۱۹۷۷/۱۰/۳۱

برادرم امین الحسن صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۴/۱۰/اکتوبر ملا۔ نائجیریا، گھانا اور دوسرے افریقی علاقوں سے

یہاں بھی کتابیں مفت بھیجنے کی فرمائشیں آتی رہتی ہیں۔ اب ہم نے ان لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ اپنے ہاں کے کسی کتب فروش کو آمادہ کریں کہ وہ ہماری کتابوں کی ایجنسی لے لیں تاکہ کتابیں وہاں آسانی سے مل سکیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

یہ بھی ان دنوں کا خط ہے جب میں ریڈینس کا ایڈیٹر تھا۔ بورڈ آف اسلامک پبلی کیشنز (ریڈینس اس بورڈ کی ملکیت ہے) کی طرف سے مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن کے انگریزی ترجمے (The Meaning of the Quran) کی دو جلدیں (سورہ توبہ تک) شائع ہوئی تھیں اور ان کی فروخت میری نگرانی میں ریڈینس بک ڈپو سے ہوتی تھی، پتانہیں اس کے کچھ نسخے کس طرح نائیجیریا پہنچ گئے اور میرے پاس وہاں سے ایک صاحب کا خط آیا کہ وہ ایک غریب مسلمان طالب علم ہیں۔ انھیں عربی نہیں آتی البتہ انگریزی آتی ہے۔ انھوں نے کسی کے پاس The Meaning of the Quran کا ایک نسخہ دیکھا ہے اور انھیں ہدیۃً ایک نسخہ بھیج دیا جائے۔ میں نے انھیں جلد اول (سورہ فاتحہ تا سورۃ النساء) کا ایک نسخہ ہدیۃً بھیج دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک اور خط گھانا سے اسی خواہش کا آیا جو ایک نو مسلم صاحب کا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کروں کیوں کہ کتاب کی قیمت کے علاوہ ڈاک کے اچھے خاصے مصارف کا بھی معاملہ تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسی مضمون کے ۳،۴ خط نائیجیریا اور گھانا سے اور آ گئے۔ تب میں نے دو ایک اہل خیر حضرات سے رجوع کیا اور انھیں پوری بات بتائی۔ ان حضرات نے ازراہِ عنایت کچھ رقم اس کام کے لیے میرے حوالہ کی اور اس رقم سے میں نے کتابیں بھیجنی شروع کر دیں۔ پھر تو خطوط کا تانتا لگ گیا۔ اس صورت حال سے میں نے مولانا مودودیؒ کو مطلع کیا۔ اس کا یہ جواب مولانا نے عنایت فرمایا۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر ۱۸) فون نمبر: ۴۲۱۱۰۱۷

۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ حوالہ: 845

لاہور-۱۲ (پاکستان) مورخہ: ۱۹۷۸/۱۰/۱۹

برادرم رضوی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

عنایت نامہ مورخہ ۷/ اکتوبر ملا۔ یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ کراچی سے واپسی پر لاہور آئے اور بارش کی وجہ سے مجھ سے نہ مل سکے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی اور ماش کی دال کا پروگرام آئندہ ملاقات کے لیے برقرار۔

حروفِ مقطعات کے متعلق میں نے جو دو مثالیں نقل کی ہیں وہ صرف یہ بتانے کے لیے نقل کی ہیں کہ اس قسم کے حروف کا استعمال قدیم اہل عرب میں معروف تھا۔ یہ خواہ اشعار میں ہو یا خطبات میں، خواہ آخر میں ہوں یا ابتدا میں، اس طریقِ کار کا استعمال کا قدیم عرب میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اہل عرب میں اس طرح مجرد حروف کا استعمال رائج تھا۔ بیماری کی وجہ سے میں اس وقت خطبات عرب میں اس کے استعمال کی مثالیں تلاش کرنے سے معذور ہوں۔

یہاں جماعت نے ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر حکومت میں حصہ لیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس اقدام کو مضرت سے بچائے اور جماعت کے وزرا کو مفید کام کی توفیق دے۔

بریلویت کے بارے میں یہ بات آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس کا فروغ عام مسلمانوں کی اپنے دین سے جہالت کے سبب ہے اس لیے عوام میں دین کی تعلیمات کا پھیلانا اور لوگوں میں دین کا فہم پیدا کرنا ہی اس کا علاج ہے۔ دوسرے کسی طریقے سے بھی اس مرض کا مداوا نہیں ہوسکتا۔

اپنے گھر میں میرا سلام کہہ دیں اور میری اہلیہ کا سلام بھی پہنچا دیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

میں 'عرض حال' میں مولانا سے اپنی تیسری اور آخری ملاقات کے تذکرہ میں لکھ چکا ہوں کہ کراچی سے واپسی میں تیز بارش کی وجہ سے میں مولانا سے نہ مل سکا تھا اس طرح ان کے گھر اپنی ضیافت (اور ماش کی دال کھانے) سے محروم رہا۔ میں نے اپنے ۱۷/۱ اکتوبر ۱۹۷۸ والے خط میں اسی بات کا تذکرہ کیا تھا کہ میری ماش کی دال ان پر قرض ہے، اس کا جواب مولانا کے اس خط کے پہلے فقرہ میں ہے۔

مولانا نے میری خواہش پر قدیم کلام عرب کے دو اشعار لکھے تھے جو حروف مقطعات پر ختم ہوتے تھے (ملاحظہ ہو خط نمبر ۶) اس کے تسلسل میں مولانا کو میں نے لکھا تھا کہ آپ نے جو مثالیں دی ہیں وہ اشعار سے ہیں اور ان میں بھی حروف مقطعات آخر میں ہیں۔ نثری کلام کی کوئی مثال براہ کرم لکھیے، جس میں حروف مقطعات آغاز کلام میں آئے ہوں، جس طرح قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں۔ اس خط کے فقرہ نمبر ۲ میں میری اس بات کا جواب ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان نے ۱۹۷۸ میں جنرل ضیاء الحق صاحب کے اصرار پر اور کافی ردّ و قدح کے بعد جنرل صاحب کی مرکزی کابینہ میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا اور جماعت کی طرف سے چار یا پانچ افراد وزیر بن گئے تھے اور خورشید احمد صاحب (اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر، انگلینڈ والے) کابینی وزیر کے ہم مرتبہ پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئر مین بنائے گئے تھے۔ مجھے جماعتِ اسلامی کے حکومت میں شامل ہونے کے فیصلے پر کچھ تردد تھا، جس کا اظہار میں نے اپنے خط میں کیا۔ مولانا کے اس خط کے فقرہ نمبر ۳ میں اسی کا جواب ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان دنوں خرابی صحت کے سبب مولانا جماعت اسلامی کی امارت سے سبک دوشی حاصل کر چکے تھے اور مولانا طفیل محمد صاحب (جو پہلے قیم جماعت تھے) امیر جماعت ہو گئے تھے لیکن اہم امور میں مولانا مودودیؒ سے مشورہ لیا جاتا تھا اور دراں حالے کہ جماعت کا دفتر اچھرہ سے کافی دور منصورہ منتقل ہو چکا تھا لیکن جب جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کو کسی اہم مسئلے پر غور کرنا ہوتا تو شوریٰ کا اجلاس منصورہ کے بجائے ۵-اے ذیلدار پارک میں مولانا مودودیؒ کی قیام گاہ پر ہوا کرتا تھا۔

پاکستان کے حالات کا جتنا کچھ میرا مطالعہ اور تھوڑا بہت جو مشاہدہ تھا اس کی بنا پر میرا خیال تھا کہ بریلوی طرزِ فکر وہاں پھیلتا جا رہا ہے اور جماعت کے اثر و نفوذ کے بڑھنے میں یہ ایک

قابل لحاظ مزاحم ہے۔ اس کا ذکر میں نے اپنے خط میں کیا تھا۔ مولانا کے خط کا فقرہ نمبر ۳ اسی سے متعلق ہے۔

'عرض حال' کے تحت مولانا مودودیؒ سے اپنی تیسری ملاقات کے تذکرہ میں لکھ چکا ہوں کہ میں جب مولانا کے گھر گیا تو میری اہلیہ بھی میرے ساتھ تھیں اور مولانا کی اہلیہ سے ان کی ملاقاتوں کی بابت بھی لکھ چکا ہوں۔ اپنے خط کے آخری فقرہ میں مولانا نے میری اہلیہ کو اسی حوالہ سے اپنا اور اپنی اہلیہ کا سلام لکھا ہے۔

رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودیؒ (نمبر ۱۹) فون نمبر: ۴۲۱۰۱۷

۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ حوالہ: ۵۷

لاہور-۱۲ (پاکستان) مورخہ: ۱۹۷۹/۱/۲۳

برادرم سید امین الحسن صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد شاہد احمد کے ذریعے سے آپ کا خط مورخہ ۲۵ رنومبر ۱۹۷۸ بڑی تاخیر سے ملا۔ آپ کی فرمائش کی تکمیل تو آپ کی یہاں تشریف آوری پر ہی ہوسکتی ہے مگر میری فرمائش آپ کسی ذریعے سے بھی پوری کرسکتے ہیں۔ محلہ بلیماران، دہلی میں فیض الحسن صاحب کے ہاں گاجر کی تری نہایت نفیس بنتی تھی۔ اگر اب بھی بنتی ہو تو وہ بھجوادیں۔ مگر وہ جاڑے ہی میں بنتی ہے اور جاڑے ہی میں یہاں تک بخیریت آسکتی ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا کا میرے نام یہ خط بھی اس زمانہ کا ہے جب میں ریڈینس کا ایڈیٹر تھا۔ ریڈینس کے پروف ریڈر محمد شاہد صاحب دفتر سے رخصت لے کر پاکستان جانے لگے تو ان کے ذریعہ میں نے مولانا کو ایک خط بھیجا۔ مجھے یاد نہیں میں نے اس خط میں کیا لکھا تھا۔ جواب میں مولانا کا یہ خط آیا تھا، جس میں گاجر کی تری بھیجنے کی فرمائش تھی۔

میں یہ خط پا کر بہت مسرور ہوا کہ مولانا نے مجھ سے اپنے لیے کوئی فرمائش کی لیکن مسئلہ یہ آن پڑا کہ میں گاجر کی تری کے نام سے واقف ہی مولانا کے اس خط سے ہوا۔ اس سے پہلے میں جانتا ہی نہ تھا کہ گاجر کی تری نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ریڈینس کا دفتر بلیماران ہی میں تھا، میں نے بلیماران کے کئی لوگوں سے معلوم کیا لیکن نہ کوئی حلوائی اور نہ کوئی اور اس سے واقف نکلا اور نہ فیض الحسن صاحب یا ان کے خاندان کے کسی فرد کو ہی جاننے والا مجھے کوئی ملا۔ میں نے جماعت اسلامی کے مرکز میں رفقا سے معلوم کیا تو وہاں بھی کوئی اس سے واقف نہ نکلا لیکن مرکز کے سب ہی رفقا کو مجھ پر رشک ضرور ہوا کہ مولانا مودودیؒ نے اپنی فرمایش مجھے لکھی۔

اتفاق سے ان ہی دنوں میری والدہ صاحبہ تشریف لے آئیں۔ میں نے ان سے معلوم کیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کی شادی سے قبل جب وہ اپنے وطن سنبھل (ضلع مراد آباد) میں رہتی تھیں تو میرے نانا یا ماموں دہلی آتے تو کبھی کبھی یہاں سے گاجر کی تری لے جایا کرتے تھے اور وہ انھوں نے کھائی ہے۔ اس سے تقویت پا کر میں نے اپنے لڑکوں سے کہا کہ وہ اور زور سے کوشش شروع کر دیں۔

بالآخر میرے ایک لڑکے (ارشد حسنین) کو ایک جگہ گاجر کی تری مل ہی گئی اور وہ تھوڑی سی نمونتہً لے آیا۔ میری والدہ صاحبہ نے اس کو دیکھ کر اور چکھ کر تصدیق کی کہ وہ گاجر کی تری ہی تھی۔ چناں چہ میں نے اچھی خاصی مقدار میں وہ خرید کر اپنی ایک عم زاد بہن کے ذریعے جو لاہور جا رہی تھیں مولانا کے پاس روانہ کر دی۔

اس کے کچھ دنوں بعد ہی مولانا کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ علاج کی غرض سے امریکہ تشریف لے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

رضوی

نوٹ

یہ بات قارئین کے علم میں ہوگی کہ مولانا مودودیؒ نے اپنی عمر کے ابتدائی دور میں شعر گوئی بھی فرمائی ہے اور طالبؔ تخلص فرماتے تھے۔ بعد میں اپنی گونا گوں علمی و تحریکی مصروفیات کے باعث اس سلسلے کو ترک کر دیا۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لیے یہاں ہم مولانا کی ایک غزل پیش کرتے ہیں۔ (اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

فطرت کی کانِ سنگ کا حاصل نہیں ہوں میں
پگھلوں نہ غم سے کیوں کہ ترا دل نہیں ہوں میں

دل میں جو ہے خیال لگا ہے وہ جاں کے ساتھ
یہ فکرِ نو رسیدہ کی منزل نہیں ہوں میں

یہ عزم ہے کہ میں رُخِ دریا کو پھیر دوں
اس رَو پہ بہنے والوں میں شامل نہیں ہوں میں

انجامِ کوہ کن سے ڈرانا مجھے عبث
جینے پہ جان دینے کا قائل نہیں ہوں میں

سچ ہے کہ مجھ میں خوئے گدائی کی بو نہیں
ہاں تیرے التفات کے قابل نہیں ہوں میں

آساں ہے ہجر بھی مجھے توہینِ عشق سے
طالبؔ تو ہوں ضرور پہ سائل نہیں ہوں میں

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ طالبؔ